اندیشۂ شہر
مرزا محمود سرحدی

اندیشۂ شہر

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI
اچھی کتاب
کا
نکھار ہمیشہ
قائم
رہتا ہے

اندیشۂ شہر

میرزا محمود سرحدی مرحوم

مرتبہ

فارغ بخاری

آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور

سن اشاعت ۱۹۷۰ء

قیمت ..... چھ روپے

تعداد ۱۲۰۰

ناشر ..... آئینۂ ادب
چوک مینار۔ انارکلی
لاہور

اشرف پریس لاہور

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	پیش لفظ	۱۳
	دیباچہ	۲۳
	نظمیں غزلیں	
۱	۱۴؍ اگست	۶۵
۲	جن کا کوئی مقام ہو وہ کبھی	۶۶
۳	ایک دن ڈھونڈتے پھروگے ہمیں	۶۷
۴	شادی کے بعد	۶۸
۵	مرا حال مجھ سے نہ پوچھئے اسے رہنے دیجئے راز ہیں	۶۹
۶	مال گودام روڈ	۷۰
۷	زمانہ کچھ بھی کہے اس کا احترام نہ کر	۷۲
۸	لوگ جن کے ستم کو روتے ہیں	۷۳
۹	کتنے ہی ہمیں ان میں سخنداں نظر آئے	۷۴
۱۰	کسان کی فریاد	۷۵
۱۱	اب وہ خود اپنی جگہ مدعی بن بیٹھے ہیں	۷۷

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۷۸	اب کفن کے لیئے بھی پرمٹ ہے	۱۲
۷۹	پرائمری سکول	۱۳
۸۱	مشاعرے	۱۴
۸۲	ناگفتنی	۱۵
۸۳	فرقیوں پہ فرقیاں ہیں ڈگریوں پر ڈگریاں	۱۶
۸۴	پرانی غزل	۱۷
۸۶	اس کو کہتے ہیں گردش ایام	۱۸
۸۷	روشن زمانہ	۱۹
۸۸	سفارش چل سکے جن کی نہ پرمٹ مل سکے جن کو	۲۰
۸۹	گل بہار کالونی	۲۱
۹۱	روڑے	۲۲
۹۳	مرے چارہ ساز تجھ سے میرا کیا علاج ہوگا	۲۳
۹۴	میں کسی پہ بھی مبتلا نہ ہوا	۲۴
۹۶	میرے پاس آکے بیٹھے تو غزل تجھے سناؤں	۲۵
۹۷	جانتا ہوں میں پارساؤں کو	۲۶
۹۸	خادمِ قوم	۲۷

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۰۰	کبھی محمل کی سجاوٹ پہ فدا ہو جانا	۲۸
۱۰۱	دیکھتا ہوں تری اداؤں کو	۲۹
۱۰۲	کنٹرول	۳۰
۱۰۳	جذبۂ شوق والہانہ ہے	۳۱
۱۰۴	نوکری	۳۲
۱۰۵	سناتا ہوں ان کو بہانے بہانے	۳۳
۱۰۶	بعد مدت کے حضور ایک غزل لکھی ہے	۳۴
۱۰۷	حقیقت	۳۵
۱۰۸	آج بھی زلف کے رخسار کے افسانے ہیں	۳۶
۱۰۹	کیا خبر ہے کہ گزاریں گے کہاں عید اب کے	۳۷
۱۱۰	جب تو ہم کوئے خرابات میں پڑھتے ہیں نماز	۳۸
۱۱۱	لوٹ تھی لوگ ادھر مال جہاں تک پہنچے	۳۹
۱۱۲	بھول بیٹھے ہیں اپنا طرزِ کلام	۴۰
۱۱۳	جشنِ آزادی	۴۱
۱۱۴	وہی آئین ہے وہی دستور	۴۲
۱۱۵	مر گئے تو کمال کیا ہوگا	۴۳

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۱۶	مرے اشعار گنگناتے ہیں	۴۴
۱۱۷	مسلمانان الجزائر	۴۵
۱۱۹	مجھ کو جب تک سرور رہتا ہے	۴۶
۱۲۰	آج اولاد کو پڑھوانے کی تکلیف نہ کر	۴۷
۱۲۱	منٹو	۴۸
۱۲۲	میری مانند جو دنیا میں ہوں دو چار غریب	۴۹
۱۲۳	قدیمی غلامو مبارک ہو شاہی	۵۰
۱۲۴	یاسین خان	۵۱
۱۲۶	کل ہم نے گزاری ہے کہاں رات نہ پوچھو	۵۲
۱۲۷	اب اپنی مملکت ہے اور اب اپنا اختیار	۵۳
۱۲۸	فرمودۂ اقبال	۵۴
۱۲۹	وہ بات کرتے ہیں ہم سے گورنروں کی طرح	۵۵
۱۳۰	سنا ہے چلتے ہیں محفل میں جن کی جام بہ جام	۵۶
۱۳۱	مردم شماری	۵۷
۱۳۴	کوئی جانے تو ان کو پہچانے	۵۸
۱۳۵	دیکھو مجھے دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھو	۵۹

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۳۶	الیکشن	۶۰
۱۳۸	نمایاں ہو گی کیا اتنی کسی اخبار کی سرخی	۶۱
۱۳۹	سفینہ ڈوب رہا ہے تو کوئی بات نہیں	۶۲
۱۴۰	تڑپتے تڑپتے گزاریں گے راتیں یہ ظاہر ہے جو دل سے مجبور ہوں گے	۶۳
۱۴۱	ہسپتال	۶۴
۱۴۳	تیری محفل تیری محفل ہے مگر	۶۵
۱۴۴	محکوم تو خوددار کبھی ہو نہیں سکتا	۶۶
۱۴۵	چند مزاح نگار	۶۷
۱۴۷	یورپ کے سائنسوں کے طریق عمل پہ چل	۶۸
۱۴۸	کوئی موٹر کی ہوا کھاتا ہے کوئی اس کی گرد	۶۹
۱۴۹	قائدِ اعظم	۷۰
۱۵۲	تو نے صیاد اگر پھر سے بگاڑا ہے تو کیا	۷۱
۱۵۳	نرخ ہر شے کا گراں ہے یارو	۷۲
۱۵۴	جو نہیں جانتے مجھ کو انھیں کہہ دو یہ فقیر	۷۳
۱۵۵	انتخابات	۷۴
۱۵۶	مارشل لاء	۷۵

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۵۸	اسمبلی یہ نہیں ہے شراب خانہ ہے	۷۶
۱۵۹	آزادی	۷۷
۱۶۱	ہاتھ آتے نہیں ہیں وہ جیب تک	۷۸
۱۶۲	کرفیو کرفیو کہہ کر نہ ڈراؤ ہم کو	۷۹
۱۶۳	وہ جو پوچھیں تو کیا کہوں ان سے	۸۰
۱۶۴	شہرت	۸۱
۱۶۵	پکارنے کا قرینہ میں سوچتا ہی رہا	۸۲
۱۶۶	چوک یادگار	۸۳
۱۶۷	بات پر جب ان کی محفل میں زباں کٹنے لگی	۸۴
۱۶۹	قطعات	۸۵
۲۵۵	متفرق اشعار	۸۶
۲۷۹	حرفِ آخر	۸۷

خود تنقیدی

جن میں آواز تھی مرے دل کی
وہ بہر طور یادگار رہے
لیکن اے دوست بارہا میں نے
پیٹ کے واسطے بھی شعر کہے

جھوٹ ہوتا ہے سچ بھی ہوتا ہے
ہم بری شاعری نہیں کرتے

پیش لفظ

ایک شکریے اور ایک معذرت سے شروع ہی میں نبٹ لوں شکریہ تو تمام کا تمام جناب فارغ بخاری کا، البتہ معذرت میں قارئین بھی شامل ہیں۔

میرزا محمود سرحدی اس دور کے چند ممتاز ترین مزاح گو شعرائ میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی دور کی بات نہیں بلکہ مزاحیہ اردو شاعری کے پورے دور میں وہ ایک اہم مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام کا مجموعہ "سنگینے" کے عنوان سے میرزا کی زندگی میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے لیکن اس کے بعد وہ اپنے کلام کی ترتیب و اشاعت کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ یہ کام ان کے بس کا تھا بھی نہیں۔ ترتیب و تنظیم کا جو احساس انکے فن و فکر میں نظر آتا ہے وہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں تقریباً ناپید تھا۔

وہ طبعًا ایک درویش منش انسان تھے ۔ ان کے بکھرے ہوئے کلام کو سمیٹ کر اس کی اشاعت کا اہتمام کرنا اردو ادب پر احسان ہے جس کیلئے جناب فارغ بخاری ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں ۔ اور میں تو ان کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کے لئے انہوں نے مجھے یاد فرمایا ۔ میں اسے اپنی انتہائی عزت سمجھتا ہوں ۔

معذرت قدرے تفصیل طلب ہے ۔ دو تین مہینے ہوئے ایک روز اچانک پشاور سے فارغ بخاری کا نوازش نامہ ملا ۔ خوشخبری درج تھی کہ انہوں نے میرزا محمود کے کلام کا مجموعہ مرتب کر لیا ہے ۔ کتاب کا نام اندیشۂ شہر تجویز ہوا ہے ۔ مجھے حکم دیا تھا کہ میں اس کا پیش لفظ لکھ دوں ۔ میری حیثیت میرزا محمود سرحدی کے ایک نیاز مند اور خوشہ چین کی سی ہے ۔ میرزا کے کلام کا پیش لفظ لکھنا میرے لئے محض خوشی کی بات ہی نہ تھی بڑے اعزاز کی بات بھی تھی ۔ چنانچہ اپنے حالات اور مصروفیات کا قطعًا لحاظ نہ کرتے ہوئے میں نے اسی وقت فارغ صاحب کو خط لکھا کہ جناب میں ضرور کچھ لکھ کر پیش کروں گا ۔ مگر یہ کوئی گرانڈیل قسم کا تنقیدی دیباچہ یا مقالہ نہیں ہو گا ۔ بس نذرانۂ عقیدت

ہوگا۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ مجھے کچھ مہلت بھی مطلوب ہوگی۔ فارغ صاحب نے فراخدلی سے دو تین ماہ کا توقف فرمایا۔ درمیان میں دو ایک مرتبہ ادھر سے یاد دہانی اور اِدھر سے معذرت کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔ مگر بدقسمتی سے میرے شب و روز کچھ ایسے تھے۔ کہ میں اس کالم کی طرف متوجہ نہ ہوسکا۔ یہ بات تو نہ تھی کہ اس کام کے لئے چند ساعتیں بھی نہ نکل سکتیں۔ لیکن فرصت کی ایسی ساعتیں واقعی نہیں مل سکتی تھیں جن میں آدمی، لکھتا رہے تصوّرِ جاناں کئے ہوئے۔ ایک تو ویسے ہی **میرزا محمود** کی شاعری ایک وسیع موضوع، پھر ان کی دلپذیر و دلنواز شخصیت، پھر اس سے بھی آگے یہ ایک اور مشکل کہ میرزا کے تذکرے میں مرحوم سے اپنی ذاتی عقیدت کے جذبات سے عہدہ برآ ہونا ضروری تھا۔ مجھے یہی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس موضوع کو کہاں سے شروع کروں اور کس طرح شروع کروں؟ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ جناب فارغ بخاری نے اپنے ایک خط میں، (بجا طور پر) اپنے تاکیدی لہجے کو قدرے طنز میں بھگو کر خبردار کیا کہ کتاب کو مصنّف کی برسی کی تقریب پہ شائقین کے

ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔ اس لئے بھائی صاحب اگر کچھ لکھنا ہے تو لکھ بھی چکو۔ سچ یہ ہے کہ اس خط کو پاکر میں تو سرے سے ہی کھو یا گیا۔ اپنی کوتاہی پر ندامت کیا، دل میں کانپ کانپ گیا۔ کہ لو ایک نہایت محترم اور عزیز زندہ دوست (فارغ بخاری) کو آزردہ کر دیا۔ اور ایک مرحوم دوست (میرزا محمود) کی روح خدا جانے کیا محسوس کر رہی ہوگی! سو اب انتہائی عجلت میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ معذرت کا اظہار اس لئے بھی ضروری تھا کہ اگر کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔

نقّادانِ ادب نے طنز و مزاح کی مختلف صورتوں مختلف رنگوں اور سایوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ نقد و نظر کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت۔ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے چونکہ میں خود بھی اسی صنف سے وابستہ ہوں۔ اس لئے طنز و مزاح کی فضیلت اور اس کی تخلیقی مشکلات کو تفصیل سے بیان کرنا میرے لئے شاید مناسب نہ ہوگا۔ تاہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو ادب میں دوسری اصناف کی

نسبت سے اعلیٰ مزاح کا سرمایہ بہت کم نظر آتا ہے ۔ صرف اُردو ہی پر موقوف نہیں ۔ غالباً ہر زبان کے ادب میں اعلیٰ پایہ کی مزاحیہ تخلیقات نسبتاً کم ہیں ۔ صنفِ شعر میں تو یہ سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ویسے یہ تعجب کی بات ہے انسان کو شگفتگی اور مسرّت کی جتنی زیادہ ضرورت ہے، ادب میں شگفتگی اور مسرت بخشنے والے ادب کا اتنا ہی زیادہ کال ہے میری سمجھ میں تو اس کی دو ہی وجہیں آتی ہیں ۔ یعنی یا تو اعلیٰ مزاح تخلیق کرنا واقعی بڑا مشکل کام ہے اور یا اصنافِ سخن کی ذات بات میں مزاح ایک کمتر حیثیت کی صنف ہے کہ قابلِ لحاظ شعراء نے اس کو چنداں لائقِ توجہ نہیں سمجھا ۔

اردو شاعری پر ایک چھلکتی ہوئی نظر ڈالنے سے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مزاحیہ شاعری ایک باقاعدہ معیاری اور مہذّب صنف کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک طویل مدّت تک اپنا مقام و مرتبہ نہیں پیدا کر سکی ۔ مقام و مرتبہ تو دُور کی بات ہے وہ ایک مدّت تک اپنے منصب، اپنی آواز اور اپنے مزاج کو بھی نہ پا سکی ۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ اردو کے ہر بلند پایہ شاعر کے ہاں شوخی و شگفتگی کا رنگ جا بجا

بکھرا ہوا ملتا ہے۔ لیکن تغزل کے وسیع اور گھمبیر سمندر میں ظرافت کی یہ پتلی سی ڈوبتی اُبھرتی ہوئی دھاری کوئی خاص وقعت یا انفرادیت نہیں رکھتی۔ شاید ادب کی ہر صنف بہت سے مراحل سے گُذرنے کے بعد ہی اپنی آواز اور مزاج کو پا سکتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی پہلا شاعر ہے جو مزاحیہ شاعری کو ریختی کی پوچ اور مبتذل غلام گردشوں سے نکال کر زندگی کے قریب لایا۔ نظیر کی شاعری اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظیر کے بعد اکبر الہ آبادی نے مزاحیہ شاعری کو ایک نئے لہجے، مزاج و معیار، معنویت، زندگی کی حرارت اور روشنی سے آشنا کیا۔ اس صنعت کو گیرائی و گہرائی، بصیرت اور دردمندی کا جوہر عطا کیا۔ اور طنز کو شگفتگی و شیرینی کی اس بلند و لطیف سطح پر لے آیا کہ مزاحیہ شاعری ادب عالیہ سے ہم آہنگ ہوگئی۔ اکبر الہ آبادی مزاحیہ شاعری کا بلند ترین اور روشن ترین مینار ہے۔ میرزا محمود سرحدی کے ادبی مقام مرتبہ کا اندازہ اسی ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کو "اکبرِ سرحد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

طنز و مزاح کے بے شمار رنگوں کی نشاندہی کی جا چکی ہے بے شمار سائے ایسے ہیں کہ جن کے ذائقے سے تو ہم آشنا ہیں لیکن نام سے واقف نہیں۔ مزاح کے مختلف رنگ اور رُوپ مختلف عوامل سے ترکیب و تشکیل پاتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا عرض کروں گا کہ مزاح سے طبیعت کے قدرتی لگاؤ کے بغیر بے ساختہ مزاح تخلیق نہیں ہو سکتا۔

مزاح کی مختلف تعریفوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔ مجھے ذاتی طور پر مزاح کی وہ بے ساختہ اور بے تکلف ادا پسند ہے جو خندہ پیشانی کے ساتھ زندگی کے کام آئے میرزا محمود کے ہاں یہ اوصاف درجۂ کمال پر نظر آتے ہیں۔ مزاح سے اُنکی طبیعت بہت ہی گہرا قدرتی لگاؤ رکھتی تھی۔ وُہ ایک قادر الکلام شاعر تھے وہ شاعری کی ہر صنف میں اُستادانہ اور خلّاقانہ اظہار و ابلاغ کی قدرت رکھتے تھے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ کسی دُوسری صنفِ سخن کی طرف کبھی راغب یا مائل نہ ہو سکے۔ اس لحاظ سے میرزا محمود مزاح گو شعراء کے پورے گروہ میں تنہا اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ وہ

ہمہ شگفتگی و مسرت تھے۔ مزاح کا سرچشمہ خود ان کی ذات کے اندر سے پھوٹتا تھا۔ ظرافت اُن کو درآمد نہیں کرنا پڑتی تھی۔ مزاح اُن کے ہاں خود آتا ہے، لایا نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا کی شاعری میں بے ساختگی کا جوہر بڑی کافرماجرائی کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے۔

میرزا محمودؔ سرحدی جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں درویش منش انسان تھے۔ بے نیاز۔ بے پروا۔ مردِ قلندر۔ انکی خواہشات کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اپنی ضروریاتِ زندگی انہوں نے بے حد محدود کر لی تھیں۔ حال مست۔ سادہ۔ سادگی پسند۔ تکلّف سے وحشت۔ انسانوں سے محبّت اور انسانوں کی خدمت ان کا اسلوبِ خاص تھا۔ مجھے ان کی شاعری پر ان کی زندگی کی بڑی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ "اندیشۂ شہر" کے اوراق آپ کے سامنے ہیں میں یہاں نمونہ کے طور پر محض چار قطعات نقل کرتا ہوں تاکہ میرزا کے اندازِ فکر اور اسلوبِ اظہار کو زندگی کے اس ماحول میں دیکھا جا سکے جس میں میرزا سانس لیتے رہے ہے

حالات

جو بھی ملتا ہے مجھ سے کہتا ہے
تازہ قطعات سُننا چاہتا ہُوں
ایسا کوئی نہیں ہے جو یہ کہے
تیرے حالات سُننا چاہتا ہُوں

خودی

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جُھکنے والوں نے رفعتیں پائیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

غلط بخشی

خدا کی دین ہے وہ جس کو بخشے
کریں کیا یہ نہ تھی قسمت ہماری
بغاوت کے ترانے ہم نے گائے
مگر بگڑے گئے فارغ بخاری

بل

ہر ایک بات پہ بل پاس ہوتے جاتے ہیں
ہر ایک بات پہ بل پیش ہوتے جاتے ہیں
غریب قوم کے افراد دن بہ دن **محمود**
خدا کے فضل سے درویش ہوتے جاتے ہیں

دیکھا آپ نے کہ میرزا محمود کا فن کس بے ساختہ، کتنے تیکھے اور کیسے شگفتہ و مؤثر انداز میں تنقید حیات کا فریضہ انجام دیتا ہے میرزا کا کمال یہ ہے کہ وہ جو بات بھی کہتا ہے سلاست اور شگفتگی سے کہتا ہے۔ اس کا طنز تلخ نہیں ہوتا میٹھا ہوتا ہے۔ مقصدیت اور مسرت کو آپس میں اس طرح ہم آہنگ کردینا کوئی آسان کام نہیں یہ خصوصیت بہت کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے میرزا محمود کے ہاں جرأت اور بیباکی کا عنصر بھی خاص توجہ کے لائق ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ انکے افکار و آراء سے اتفاق ہی کریں لیکن اس شخص کے خلوص اور اسکے لہجے کی سچائی اور بے باکی سے انکار نہیں کیا جاسکتا موجودہ دور میں جن شعراء نے مزاحیہ شاعری میں امتیاز پیدا کیا ہے انکی تعداد ایک ہاتھ کی اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے میرزا محمود سرحدی اس مختصر مگر منفرد گروہ میں اپنا ایک منفرد رنگ رکھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ انکی دلپذیر شاعری ہمیشہ زندگی کی آبیاری اور رہنمائی کرتی رہے گی ؂

سیّد ضمیر جعفری

۳۱۔ ڈی۔ سٹلائٹ ٹاؤن

راولپنڈی

۱۶ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

دیباچہ

میرزا محمود سرحدی ددھیال سے مغل اور ننھیال کی طرف سے پختون تھے۔ ان دو جنگجو خاندانوں کے ملاپ سے میرزا نے جنم لیا۔ سپاہیانہ مزاج ورثے میں پایا۔ مغل اور پختون فاتح کی حیثیت سے تاریخ میں مشہور ہیں۔ میرزا ہوش سنبھالتے ہی فوج میں بھرتی ہو گئے لیکن وہاں میدانِ کارزار میں بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا تو مستعفی ہو کر ادبی فتوحات کا بیڑا اٹھایا۔

ظرافت اور خوش طبعی میرزا کی جبلت میں شامل تھی۔ اس لئے اُنہوں نے شاعری میں بھی طنز و مزاح کا سنگلاخ میدان پسند کیا اور اس میں بھی اکبر الٰہ آبادی مرحوم کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ ہر بڑے صاحبِ طرز شاعر کی طرح اکبر بھی اپنے طرز کا خود ہی مُوجد بھی تھا اور خاتم بھی ——— میرزا کو بھی اکبر کی پیروی میں بڑی

دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ سپاہی بچہ ہار ماننے والا نہ تھا۔ اسی دھن میں رات دن ایک کر دیئے۔ اور آخر اس آہنی قلعے پر اپنی شہرت و ناموری کا جھنڈا گاڑ کر ہی دم لیا۔

پختون مزاج اور فوجی ملازمت کا میرزا کی زندگی پر گہرا اثر تھا۔ اپنی تیز و تند خو اور جذباتی افتادِ طبع کے اعتبار سے انھیں سرحدی مکتبۂ فکر کے ایک ایسے نمائندہ کی حیثیت حاصل تھی کہ ان میں اس سکول کی تمام تر خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ وہ غیرت و حمیت کے مجسّمہ تھے۔ کھرے، بیباک اور نڈر ——— دوستوں کے جانی دوست اور دشمن کے خطرناک حد تک دشمن ——— راست گو ایسے کہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے صاف کہتے، منہ پر کہتے اور بعض اوقات تو ان کی تلخ نوائی اس عالم کو پہنچ جاتی کہ بقول شاعر

کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

لیکن ایک صاف دل انسان کی طرح وہ جلد ہی اس کی تلافی بھی کر دیتے۔ تاہم وہ کسی کے آگے جھکنا یا معذرت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اپنی بات پر اڑ جانا اور ہر بات میں انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کرنا بھی

ان کی پختون فطرت کا ایک خاص وصف تھا۔ اس طرح بُرے سے بُرے حالات میں بھی اپنی آن پر قائم رہنا اور اپنی شان کو برقرار رکھنا اُن کا شیوہ تھا۔ وضعدار ایسے کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے۔ وفات سے چند برس ادھر ان کی صحت کی خرابی اور مالی پریشانیوں کے پیشِ نظر دوستوں نے کوشش کر کے پاکستان رائٹرز گلڈ کی وساطت سے ان کے لئے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ صدارتی وظیفہ مقرر کرایا۔ وظیفے کی منظوری کی جو اطلاع اُنھیں ملی اُس چٹھی میں لکھا تھا کہ "اُنکی معذوری کے باعث یہ وظیفہ منظور کیا جاتا ہے"۔ یہ چٹھی پڑھتے ہی میرزا بگڑ گئے کہ ان پر رحم کھا کر یہ خیرات دی جا رہی ہے۔ وہ کوئی بھکاری نہیں۔ یہ وظیفہ اس طور پر وہ ہرگز قبول نہیں کرینگے۔ احباب نے لاکھ سمجھایا۔ لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ فوراً ایک خط لکھ کر شکریہ کے ساتھ وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ اور صاف صاف لکھ دیا کہ اگر میرے فن کی قدردانی کے طور پر وظیفہ دیا جائے تو مجھے انکار نہیں۔ لیکن خیرات کا نہ میں مستحق ہوں نہ ہی اپنی یہ توہین گوارا کر سکتا ہوں۔ چنانچہ پھر بڑی تگ و دو کے بعد اُن کے

ایما ر کے مطابق اس چھٹّی کے الفاظ میں ردّو بدل کیا گیا۔ جب کہیں جاکر وہ رضامند ہوئے۔

یہ ان کی غیور طبیعت کی سینکڑوں مثالوں میں سے ایک ایسی مثال ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وُہ اپنی خودداری اور عزّتِ نفس کے معاملہ میں کس قدر محتاط واقع ہوئے تھے۔

شعروشاعری کا میرزا کو اوائل ہی سے لپکا پڑ چکا تھا۔ طالبعلمی کے زمانہ ہی سے وہ موزوں اشعار کہنے لگے تھے۔ تعلیم سے فراغت پاکر باقاعدہ اس طرف توجّہ مبذول کی۔ ان کی ابتدا سنجیدہ شاعری سے ہوئی۔ ان کی ایک ابتدائی غزل کے جو طرحی مشاعرے کیلئے لکھی گئی تھی، دو شعر ان کی سنجیدہ شاعری کے نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں ؎

یہاں جینا کوئی آساں نہیں ہے، کہ جیسا آسماں ویسی زمیں ہے

ہوا دُشوار ہم کو بات کرنا
ہوائے کوئے جاناں سُرمگیں ہے

ان ایّام میں بھی وہ اپنی سنجیدہ غزل میں ایک آدھ مزاحیہ شعر کہہ جاتے تھے۔ مثلاً اسی غزل کا ایک شعر دیکھئے ؎

وُہ ایسے ہٹ کے پکّے ہیں کہ توبہ
نہیں ہے تو قیامت تک نہیں ہے

بعد میں جلد ہی اُنھیں اپنی افتادِ طبع کا اندازہ ہوگیا۔ اور اُنھوں طنز و مزاح کی راہ اختیار کرلی۔ چنانچہ انہی دنوں ایک مشاعرے میں جب انھوں نے یہ دو قطعے پڑھے ؎

ہم غریبوں سے آپ کیوں صاحب
مفت کے جھگڑے مول لیتے ہیں
آپ کی طرح سے تو انگریزی
خانسامے بھی بول لیتے ہیں

جھوٹ کہتا ہُوں اور بے کھٹکے　　کون سچ کہہ کے دار پہ لٹکے
کیا کہیں کیسے آسماں سے گرے　　اور کیونکر کھجور میں اٹکے

تو مشاعرہ لوٹ پوٹ ہوگیا۔ سارا ہال گونج اُٹھا۔ یہ قطعات بار بار پڑھوائے گئے۔ میرزا کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اور سارے شہر میں اُن کے چرچے ہونے لگے میرزا کیلئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اب انھیں بھی احساس ہؤا کہ اس کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس کے بعد وُہ پُوری توجّہ سے اسی رنگ میں شعر کہنے لگے۔

میرزا کے کلام میں طنز وظرافت کو بُنیادی حیثیت حاصل ہے ان کے اشعار میں اپنے معاشرے کے نقوش کچھ اس طرح اُبھرتے ہیں کہ ان کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ؂

میری تنخواہ سو ہے اور اُن کے
آٹھ سو کے قریب ہوتے ہیں
جب مہینہ تمام ہوتا ہے
مَیں بھی روتا ہُوں وہ بھی روتے ہیں

میرزا اکبرؔ کے سچّے مقلّد تھے۔ ایسے سچّے مقلّد کہ انگریز دشمنی اور مغربی تہذیب کی مخالفت کے علاوہ اُنھوں نے بعض ایسی باتوں میں بھی اکبرؔ کا تتبّع ضروری سمجھا جو نہ صرف روشن خیالی کے منافی ہیں بلکہ انکے اپنے ترقی پسندانہ رُجحان سے بھی کسی طرح لگا نہیں کھاتیں مثلاً

فرسودہ روایات سے اندھی عقیدت اور نئے تقاضوں سے رُوگردانی تعلیمِ نسواں کی مخالفت، پردے کی حمایت، آزادیٔ نسواں سے بَیر اور دَورِ قدیم کی مجہول روایت کے مطابق عورت کو ناقص العقل سمجھنا اور مرد کی برتری کے ڈھول پیٹنا ؎

والدین مبتلا ہیں فالج میں
لڑکیاں پڑھ رہی ہیں کالج میں،

انگریزی پڑھ کے لڑکیاں بے باک ہو گئیں
دھوئی گئیں کچھ ایسی کہ بس پاک ہو گئیں

خواہ کتنے ہی اوج پر پہنچے
عورت عورت ہے اور مرد ہے مرد

مَیں نے اِک دُخترِ ملّت سے یہ اک روز کہا
حُسن اپنے کی نہ اس طرح سے رُسوائی کر

ہنس کے کہنے لگی اقبالؔ نے فرمایا ہے
پردہ چہرے سے ہٹا انجمن آرائی کر

تاہم اکبر کی تقلید کوئی آسان نہیں۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میرزا کے ہاں اکبرؔ کی تقلید کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ ان کا اپنا ایک منفرد رنگ ہے مخصوص انداز ہے متنوع اسلوب ہے۔ اُنکی ظرافت اپنے ماحول کی جڑوں سے پھوٹی ہے۔ اُن کے بے پناہ طنز نے زندگی کے مصنوعی چلن، جھوٹی وضعداری اور سماج کے کھوکھلے دعاوی پر کاری ضربیں لگائی ہیں۔

میں ماتحت تھا آپ افسر تھے — سچی بات اب کون کہے
میرے ہاں تو مینہ برساتھا — آپکے ہاں پرنالے بہے

عورتوں کا بھی نمائش میں ہے اک مخصوص دن
لوگ بھی ہیں اس پہ خوش اور مہتمم بھی شاد ہیں
مرد کا سایہ نظر آتا نہیں ہے دُور دُور
صرف اسٹالوں پہ ساڑھے تین ہزار افراد ہیں

میرزا کی بے پناہ ذہانت ان کی ظرافت کے جوہر نکھارنے میں بڑی

مسلمہ ثابت ہوئی ہے۔ اس ذہانت کے بل بوتے پر انھوں نے روز مرّہ کی معمولی باتوں سے بھی مزاح پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس پر اُن کے چبھتے ہوئے طنز اور نوکیلے اسلوب نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

یہ سُوٹ اچھّا ہے پر گیا کریں کہ سستا ہے
خرید لیں تو ہمیں پھر رئیس کون کہے

مخلص سمجھ کے جس سے کہا حالِ مفلسی
اس نے سمجھ لیا کہ اسے قرض چاہیئے

فُرقتیوں پر فُرقیاں ہیں ڈگریوں پر ڈگریاں
پاس کرتے جا رہے ہیں امتحاں پر امتحاں

اردو ادب میں مزاح کی روایت عموماً سستے مذاق اور پھکّڑپن پر قائم ہے۔ دو ایک مزاح نگاروں کو چھوڑ کر باقی سب نے جرأت وانشا

کے نقش قدم پر چلنے ہی کو فن کی معراج سمجھا۔ فقرے بازی اور لفظوں کے شگوفے کھلا کر واہ واہ کرا لی۔ یا ہجو ہی کو مزاح سمجھ بیٹھے۔ یا ننگ دھڑنگ شعر کہہ کر مزاح نگار کہلائے۔ زیادہ کمال دکھایا تو غالب کے مصرعوں کے سہارے طنز و مزاح کے گل بوٹے کھلانے کی کوشش کی اور بس ——

اُردو میں طنز و مزاح کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو جہاں سُوقیانہ، پھکّڑ اور ہزل گو شعراء ڈھیروں ملتے ہیں وہاں صحت مند اور معیاری مزاح نگار شعراء انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ متقدّمین میں نظیر اکبر آبادی اس کے بانی مبانی ہیں۔ اس دور میں سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غرُوب ہو رہا تھا۔ ہر طرف افرا تفری کا عالم تھا۔ حکران اور جاگیر دار طبقہ عیش و نشاط اور رنگ رلیوں میں غرق دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ عوام کی زبوں حالی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ نظیر اکبر آبادی اس شکست خوردہ عہد کے المیہ کا حقیقی ترجمان تھا۔ اسکی شاعری اس دور کے عوام کی کراہ بن کر اُبھری جس نے اپنے ماحول کے تمام کرب کو سمیٹ لیا۔ وہ رقیق القلب ہوتا تو اس کی شاعری مرثیہ بن کر رہ جاتی۔ لیکن اپنی طبعی

رجائیت نے اسے مرثیہ گو کے بجائے ایسا طنّاز شاعر بنا دیا جس نے اپنے معاشرے کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ اس کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اُجاگر کر کے اپنے فن کو لافانی بنا دیا۔

برّصغیر ہند و پاک پر برطانوی تسلّط کے ساتھ انگریزی تہذیب کلچر کا بھی یہاں عمل دخل بڑھنے لگا۔ نئی اور پُرانی تہذیبوں کے تصادم سے پُرانی اقدار کی شکست و ریخت اور نئی تہذیب کی چکا چوند نے جو غیر یقینی فضا پیدا کی اس کی بھرپور عکّاسی لسان العصر اکبؔر الہ آبادی کے حصّے میں آئی جو متوسّط دور کا ایک عظیم طنّاز شاعر تھا۔ انگریز دشمنی اور انگریزی تہذیب کی مخالفت اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ تھا اکبؔر نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور اپنی صحت مند طنزیہ و ظریفانہ شاعری سے اس کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ نظیؔر اکبر آبادی کے بعد اکبؔر الہ آبادی کی تیکھی شاعری کے اَن مٹ اور لازوال نقوش ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

تقسیمِ مُلک کے بعد دم توڑتے جاگیردارانہ نظام اور اُبھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام نے بیسیوں نئے مسائل کو جنم دیا۔ ایک طرف

مغربی تہذیب کے تباہ کن اثرات اور دوسری طرف آجر و مزدور ، غریب و سرمایہ دار کی کشمکش ، بے روزگاری ، بدحالی ، رشوت ستانی ، چور بازاری اور اس کے نتیجہ میں ایسا جرائم پیشہ اور مریض معاشرہ جس نے عوام کی زندگی دوبھر کر دی ۔ حکمران طبقے اور سرمایہ داروں کے گٹھ جوڑ سے گذشتہ ۲۳ برس تک ملک میں لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا بازار گرم رہا ۔ امیر طبقہ امیر ترین ہوتا گیا اور غریب بھوک اور احتیاج کی دلدل میں دھنستا گیا ۔

ہر دور کا ادب اس دور کے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور اس عہد کے تقاضے اسے جنم دیتے ہیں ۔ اس دور میں بھی شعراء کی اس کھیپ کو جو راجہ مہدی علیخان ، سیّد ضمیر جعفری ، سیّد محمد جعفری اور میرزا محمود سرحدی پر مشتمل ہے اپنے معاشرے اور ماحول کے تقاضوں ہی نے پیدا کیا ۔

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں معیاری طنز و ظرافت کو اپنانے والے صرف دو شاعر اکبر اور اکبر نظر آتے ہیں ۔ اس لحاظ سے ہمارا یہ عہد زیادہ تابناک ہے کہ اس میں ایک دو نہیں پورے

چار ایسے بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے جن پر یہ فن بجا طور پر تفخر کر سکتا ہے۔ ان چار شعراء میں سے ہر ایک کا اپنا الگ رنگ مخصوص لہجہ اور منفرد انداز ہے۔

میرزا محمود سرحدی عہد حاضر کے انہی ممتاز، صحت مند اور معیاری طنز و مزاح کو اپنانے والے شاعروں میں سے ہے۔ میرزا کا عمل تخلیقی ہے۔ اس میں گہرائی اور ہمہ گیری ہے۔ تفکّر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فن ہے وہ فن جو مقصدیت کا حامل ہے جو محض ہاؤ ہُو تک محدود نہیں بلکہ دُور رس نتائج کا آئینہ دار ہے ۔

اقتصادی مسئلہ ہے یہ نہ ہم سے پُوچھئے
کیا کہیں کیوں ہمکو خوش پوشی کی عادت ہوگئی

بجائے پھُولوں کے سونا چڑھاؤ قبروں پر
تو اُن کی رُوحوں کو شاید کہیں قرار آئے

سوچتے ہی نہیں ہیں یہ زر کے سوا
ہے یہی ان کا مذہب یہی ہے خُدا

میرزا اپنے معاشرے کی پوری تاریخ کا علم رکھتے ہیں۔ وہ ان خرابیوں کے جس پہلو پر قلم اُٹھاتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اسکے سارے پردے اُٹھا کر قاری کو اس کی اصلیت کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک زاویے کا تماشا دکھا رہے ہوں۔ وہ سب کچھ کہہ کر جیسے حیرت سے مجسّم سوال بن جاتے ہیں "ایسا کیوں ہے" وہ جو کچھ کہتے ہیں آخر میں ایک خلش ہمارے ذہنوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ہمیں سوچتا چھوڑ کر خود چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

غم و خوشی فطری چیزیں ہیں۔ رونا اور ہنسنا ہر انسان سیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کسی کو ہنسانا یا رُلانا اور وہ بھی شعر و ادب میں نہایت کٹھن کام ہے۔ اسی لئے مرثیہ نگار اور مزاح نگار بننے کیلئے غیر معمولی سوجھ بوجھ اور نفسیاتی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح کسی کو رُلانا مشکل کام ہے اسی طرح ہنسانا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے پشتو کے مزاح نگار شاعر راحت سیال کی کتاب کے دیباچے کا یہ اقتباس کافی ہوگا:-

"ادب میں مزاح، طنز اور فکاہی انداز جتنا بلند مقام رکھتا ہے اتنا ہی اس کیلئے محنت اور ریاضت درکار ہے۔ اگر فنکار ذرا بھی غفلت برتے تو فکر کا گھوڑا زعفران زار کے بجائے دلدل میں دھنس کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ طنز و مزاح سنجیدہ فکاہی ادب اور تمسخر و خرافات میں بڑا فرق ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ سعدیؔ اور چرکینؔ کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں سعدیؔ میں لطیف اور مقصدی طنز و مزاح ہے تو چرکین میں خرافات کی بُو۔"

میرزا صحت مند طنز نگار ہے۔ طنز گہرا ہو تو اس کا وار تلوار سے زیادہ کاری ہوتا ہے۔ اجتماعی اور ہمہ گیر طنز سے شاعر کے بالغ شعور کا پتہ چلتا ہے۔ میرزا کے ہاں یہ شعور رچا بسا محسوس ہوتا ہے ؎

حقیقت کی تجھ کو خبر ہی نہیں ہے
نہ جا ان کے ظاہر پہ میرے مرّبی
کمائی پہ رشوت کی اکثر بنے ہیں
وہ گھر جن پہ لکھا ہے "مِن فضلِ ربّی"

کسی کو کسی سے نہیں کچھ حسد
کسی کو کسی سے نہیں ہے گزند
اب ان کی حکومت ہے۔ اے بے خبر
کہ تحت الثریٰ پر ہے جن کی کمند

میرزا کا کلام پڑھتے ہوئے اکبرالہ آبادی کی شاعری کی یادیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس میں اکبر کی ساری ڈھکی چھپی خصوصیات ملتی ہیں۔ مزید برآں ایسا گہرا سماجی اور طبقاتی شعور بھی کارفرما ہے جو شاید اکبرآبادی کے سوا میرزا سے ماقبل یا ان کے معاصرین میں کسی مزاح نگار شاعر کو نصیب نہیں ہوسکا۔

کیا کیا نہیں یہ کرتے بہروپئے مداری
مذہب کو بیچتے ہیں یہ پیٹ کے پجاری

ہیں یہاں پر سامراجی جب تلک   یہ جہاں آباد ہو سکتا نہیں

اپنے مرکز سے ہٹ گئی دنیا
گورے کالے میں بٹ گئی دنیا

چاک دامانی ہماری دیکھ کر ہنستے ہیں لوگ
یہ نہیں معلوم ہم عاشق نہیں بے کار ہیں

دینِ حق کو کرو نہ یُوں بدنام
زر پرستی کہاں، کہاں اسلام

میرزا ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے۔ انھیں زندگی گذارنے کیلئے بڑے جتن کرنے پڑے۔ فوجی نوکری سے لیکر سکول ٹیچری تک اور کلرکی سے مزدوری تک کئی مراحل سے گذرنا پڑا۔ اس سفر میں نوکر شاہی ذہنیت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا انھیں نہایت تلخ تجربہ ہؤا۔ انہیں محنت و سرمایہ کے تضاد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور استعماری طاقتوں کے استحصالی ہتھکنڈوں اور سازشوں کا اُنہوں نے بالکل عُریاں نظارا کیا۔

کوئی فریاد سُنانے کا ذریعہ ہے نہ خیر
ورنہ درخواست کے لکھوانے کی تکلیف نہ کر

ہر ایک بات پہ بل پاس ہو رہے ہیں یہاں
ہر ایک بات پہ بل پیش ہوتے جاتے ہیں
غریب قوم کے افراد آئے دن محمود
خدا کے فضل سے درویش ہوتے جاتے ہیں

میرزا طنز کے بادشاہ اور ظرافت کے شہنشاہ تھے۔ اپنے فن پر انھیں کامل دسترس حاصل تھی۔ اکبر الٰہ آبادی کا رنگ اپنانے کے باعث وہ اکبرِ سرحد کہلاتے تھے۔ ان کا طنز کٹیلا اور گہرا تھا۔ وہ بیباک شاعر تھے۔ اور معاشرے کی بدعنوانیوں پر بے لاگ تنقید کرنے سے انھیں کوئی مصلحت نہیں روک سکتی تھی۔ وہ ہوائی اور خیالی موضوعات کے بجائے روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنا موضوع بناتے۔ اور اس میں مزاح کا پہلو نکال لیتے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ ڈھکے چھپے واقعات سے اس طرح پردہ اٹھاتے کہ قاری کو ہنسی بھی آتی اور وہ سوچنے پر بھی مجبور ہوتا۔ بسا اوقات تو یوں لگتا جیسے شاعر نے ہمارے منہ کی بات چھین لی ہے۔

میرزا کے بے رحم طنز سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ سی آئی ڈی نے ترقّی پسند شاعر سمجھ کر اُن کا تعاقب شروع کیا تو پکار اُٹھے

پھرتی رہتی ہے پیچھے خفیہ پولیس
قافیہ تنگ ہوتا جاتا ہے

ترقّی پسند ادیبوں پر حکومت کا عتاب نازل ہوا تو بولے

کون ہے جو نہیں ترقّی پسند
کر لو۔ کتنے کرو گے جیل میں بند

جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا مودودی کی گفتار و کردار کا تضاد دیکھ کر کہا

نہیں کھلتا یہ عقدہ آج تک کیا شے ہے یہ لیڈر
کہ باتیں فقر کی کرتا ہے اور بنگلے میں رہتا ہے

سیاسی لیڈروں کی دھاندلیوں پر لکھا

یہی ہیں گر سیاسی رہنما تو
ہماری قوم کا اللہ حافظ

مغربی پاکستان کے ایک یونٹ بننے پر کہا

پہلے ہی کوئی کم تھی عنایت جناب کی
یونٹ بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی

سابق صدر محمد ایوب خان کی آمریت پر یوں طنز کیا۔

جو ملی ایوب کی صورت ہمیں
ہے سزا یہ شامتِ اعمال کی

ملک کی معیشت پر بائیس خاندانوں کے تسلط کا اس دلچسپ انداز میں ذکر کیا۔

اک قہر بن کے ہم پہ مسلط ہوئے ہیں یہ
بائیس خاندان ہیں اور ہم ہیں دوستو

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھارتی سورماؤں کا یوں مذاق اُڑایا۔

حملہ کرتے ہی مہاشے پٹ گئے
نوچ لیں شیروں نے ان کی بوٹیاں
غاصبوں پر ہم نے جب یلغار کی
بھاگ نکلے چھوڑ کر لنگوٹیاں

جتنے بھی گر یاد تھے سب طاقِ نسیاں ہو گئے
جنگ ہم سے چھیڑ کر لالے پریشاں ہو گئے

گاندھی جی کے قتل پر کہا ؎

کیا عجب ہے کہ کوئی ہم سا غریب
ایرے غیرے کے ہاتھوں مارا جائے
لیکن افسوس ہے کہ گاندھی جی
نتھو خیرے کے ہاتھوں مارا جائے

میرزا کی شاعری نظم، غزل اور قطعات پر مشتمل ہے۔ نظموں میں زیادہ گہرائی نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر ہنگامی قسم کی ہیں۔ ہلکی پھلکی مگر طنز سے بھرپور اور ظرافت سے معمور۔ ۱۴ اگست۔ شادی کے بعد۔ پرانی غزل۔ قائدِ اعظم۔ انتخابات۔ مارشل لا۔ اور آزادی ان کی مشہور و مقبول نظمیں ہیں۔ ان میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں کہ ہنگامی ہونے کے باوجود ان کی افادیت مسلّم ہے۔ اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں ؎

یومِ آزادی ہے اور ہم ہر طرح آزاد ہیں
بیٹھ جائیں جس جگہ کوئی اٹھا سکتا نہیں

خواہ بھوکے ہیں تو کیا ہم خواہ ننگے ہیں تو کیا
پادشاہی پہ ہماری حرف آ سکتا نہیں
کیا یہ کم ہے اپنی دولت جاتی ہے انیوں کے پاس
رشوتیں اب کوئی بیگانہ تو کھا سکتا نہیں

(۱۴ اگست)

جب وہ پہلے ملی تو چپ چپ تھی
اور میں تھا کہ بولے جاتا تھا
وہ دوبارہ ملی تو میں چپ تھا
اور اسے بولنے کا لپکا تھا
ہوئی شادی تو دونوں چپ چپ تھے
بولنے والا صرف ملّا تھا
پھر یہ عالم تھا دونوں بولتے تھے
اور سارا محلہ سنتا تھا

(شادی کے بعد)

نظم "پرانی غزل" میں ان شعراء پر طنز کیا گیا ہے۔ جو اپنی آواز کے باعث

مشاعروں میں تو مقبول ہو جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا اثاثہ عموماً دو چار لکھی لکھائی غزلیں ہی ہوتی ہیں۔ جو سالہا سال تک وہ ہر مشاعرے میں بار بار پڑھکر سامعین کو بور کرتے رہتے ہیں ؎

ہزار بار اسے سن چکے ہیں مجھ سے عوام
یہ سامعین کو اب یاد ہو چکی ہے تمام
ازل سے تا بہ ابد ہے یہ میرا "تازہ کلام"
سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں
وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

اور آخری بند ملاحظہ ہو

اسی غزل نے میری دھوم بھی مچائی ہے
جہاں بھی میں نے سنائی ہے داد پائی ہے
خبر نہیں ہے کسی کو کہ یہ پرائی ہے!
سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں
وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

میرزا کی غزلوں میں عموماً چار پانچ سے زیادہ اشعار نہیں ہوتے۔ ان میں

بھی بسا اوقات سنجیدہ شعر آجاتے ہیں۔ لیکن ہر غزل میں دو ایک شعر ایسے معرکے کے ہوتے ہیں جن میں ان کا اپنا مخصوص رنگ پوری تابناکی سے جھلکتا رہے ہے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، نہ مکاں ملا نہ دُکاں ملی
جو مکاں ملا تو دمشق میں جو دُکاں ملی تو حجاز میں
کرم اے شہِ عرب و عجم ہے وہ روٹیوں کا پرابلم
کھڑے ہم ہیں ایسے قطار میں کہ کھڑے ہوں جیسے نماز میں

جھوٹ کہہ سکتا ہوں ایمان ڈبو سکتا ہوں
پھر بھی لیڈر وہ نہ سمجھیں تو مرے اپنے نصیب
ساری تقدیر کی باتیں ہیں وگرنہ محمودؔ
مَیں بھی ویسا ہی سپاہی ہوں کہ جیسا ہے نجیب

کوئی موٹر کی ہوا کھاتا ہے کوئی اس کی گرد
دیکھتا جا اِس کو کہتے ہیں جہاں کے گرم سرد

نظم ہو یا غزل قطعات سے میرزا کو ایسی رغبت ہے کہ ان کے اشعار میں قطعات ہی کا انداز ملتا ہے۔ خصوصاً غزل میں تو ہر دو شعر ربط و اثر کے لحاظ سے قطعے ہی لگتے ہیں۔ قطعات کی طرف غالب رُجحان کے باعث ان کی سوچ گویا اسی رنگ میں ڈھل گئی ہے۔ اُنھوں نے غزلیں بہت کہی ہیں لیکن ان میں بہت کم غزلیں ایسی ہیں جنہیں کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ عام طور پر ان غزلوں میں کام کے شعر کم ہی ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی غزل میں تغزّل کی تلاش بھی بے سُود ہے۔ ویسے تو آج غزل میں اتنی وسعت آچکی ہے کہ وہ محض حُسن و عشق کے موضُوع تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ روز بروز زندگی کی تمام وسعتوں کو سمیٹ کر بیکراں بن رہی ہے۔ تاہم اس میں غزل کی مترنّم زبان کومل لہجہ اور مخصوص مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہی اوصاف اسے دوسری اصنافِ سخن سے ممیّز کرتے ہیں۔ میرزا اپنی غزل میں ان بنیادی باتوں کی طرف بھی توجہ نہیں دے سکے۔ شاید اس لئے کہ ان کا فن ان تکلّفات کا متحمّل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک مقصدی شاعر تھے۔ اپنے مقصد کی راہ میں کسی رُکاوٹ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے

تھے خواہ وہ کتنی ہی ناگزیر کیوں نہ ہوں۔ وہ غزل کے تقاضوں سے
غافل نہ تھے لیکن ان کے مقابلہ میں انھیں اپنے آدرش کے تقاضے
زیادہ عزیز تھے جن پر وہ ہمیشہ نہایت سختی سے کاربند رہے اور
کوئی رسمی حد بندی بھی انھیں اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکی۔ اس
نقطۂ نظر سے ہم ان کی غزل کو دیکھیں تو شاید زیادہ مایوسی نہ ہو۔
میرزا سیماب صفت انسان تھے۔ کوئی کام جم کر کرنا اُن کے
بس کی بات نہ تھی۔ دوستی سے دشمنی تک اور ملازمت سے شاعری
تک کسی بات میں بھی ثابت قدم نہ تھے۔ اپنے اسی تلوّن کے باعث
وہ گرہستی کے علائق سے زندگی بھر گریزاں رہے۔ رہن سہن، پوشاک
اور خوراک کے معاملہ میں کوئی پابندی گوارا نہ کی۔ حتّٰی کہ اپنے تشویشناک
مرض میں بھی ڈاکٹروں کی ہدایت کے باوجود اُن کے طبعی تلوّن نے
علاج معالجے اور پرہیز کی قید قبول نہ کی۔

غالبًا اسی افتادِ طبع کی وجہ سے ان کی طبیعت کو قطعات سے
دِلی لگاؤ تھا۔ ان کی جذباتی فطرت کے لئے نظم یا غزل کی قیود
ناقابلِ برداشت تھیں۔ قطعہ ایک مشکل صنفِ سخن ہے لیکن اپنے

اختصار۔ تنوّع اور جامعیت کے اعتبار سے یہ صنف ان کی تمام تر توجّہ کا مرکز بن گئی۔ ان کی مہم جوئی بھی کُوزے کو دریا میں بند کرنے کی اس مہم کے لئے ہر طرح موزوں تھی۔ انھیں اپنے فن سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ ہر وقت فکرِ سخن میں ڈُوبے رہتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ محفل جمی ہے۔ کسی نہایت اہم موضوع پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے کہ اچانک ان کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ سر جھک جاتا وہ مراقبے کے عالم میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے اور جب یہ کیفیت گُذر جاتی تو وہ کوئی پھڑکتا سا قطعہ سُنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ قطعات میں انھیں ایسا ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ بڑے سے بڑے مضمون کو نہایت خوبی سے چار مصرعوں میں سمو کر پیش کر دیتے اور اس میں وہ بات پیدا کرتے جو پُوری نظم میں بھی نہ کہی جا سکتی۔ میرزا کے قطعات اختصار و ایجاز کے ایسے کرشمے ہیں، جن میں طلسماتی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ فن بھی انھوں نے اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے سیکھا۔ اور اسے پُوری کامیابی سے برت کر دکھایا۔

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں دیکھیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

مت پوچھ مرا حالِ خراب اے ساقی
عادت بھی ہے اک گُونہ عذاب اے ساقی
کھانے کے لئے ملتی نہیں ہے روٹی
پیتا ہُوں مگر روز شراب اے ساقی

حلف اٹھا لینے کے فوراً بعد ہر تازہ وزیر
قائدِ اعظمؒ کے مرقد پر بھی جاتا ہے ضرور
اور وہاں جا کر یہ کہتا ہے وہ ان کی روح سے
میرے ہاتھوں قوم اچھا دِن نہ دیکھے گی حضور

میرزا ایک باشعور اور حقیقت پسند شاعر تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف دُنیا جہاں پر تنقید کی بلکہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کیا۔ ان کے مندرجہ ذیل قطعات خود تنقیدی کی ایک قابلِ تقلید مثال ہیں ؎

جن میں آواز تھی مرے دِل کی
وہ بہر طور یادگار رہے
لیکن اے دوست بارہا میں نے
پیٹ کے واسطے بھی شعر کہے

دوست احباب مجھ سے نالاں ہیں
رنگ لاکر رہے گا میرا جنوں
سکھ تو بارہ بجے کے بعد ہے سکھ
مجھ کو دیکھو کہ ہر گھڑی سکھ ہوں

اور پھر یہ قطعہ جس میں اُنھوں نے اپنی زندگی کے المیئے کو مجسم کر کے پیش کر دیا ہے ؎

جو بھی ملتا ہے مجھ سے کہتا ہے
تازہ قطعات سُننا چاہتا ہوں

ایسا کوئی نہیں ہے جو یہ کہے
تیرے حالات سننا چاہتا ہوں

اب تک کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں ہوا جس سے ناپ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کسی کلام میں طنز کی مقدار کیا ہے اور مزاح کا کیا تناسب ہے۔ تاہم دیکھنے میں آیا ہے کہ عام طور پر ایسے شعراء کے ہاں مزاح کو فوقیت اور طنز کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ لیکن وہاں بھی قریب قریب دونوں پلڑے برابر ہی نظر آتے ہیں۔ میرزا کو اکبر سے بڑھانا مقصود نہیں۔ وہ لسان العصر تھے اور بلاشبہ اردو شاعری کے عشرۂ مبشرہ میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن حقیقتاً میرزا کے کلام پر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر طناز واقع ہوئے تھے اُن کے ہاں طنز غالب ہے اور مزاح یا تو طنز سے چھوٹی ہے یا جزوی طور پر آئی ہے۔ اور ایک سب سے بڑی خوبی یہ کہ مقصد کا دامن کبھی بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ یعنی اُنھوں نے اپنی شاعری کو اس رنگ کے بیشتر دوسرے نئے پُرانے شعراء کی طرح محض تفریح کا ذریعہ کبھی نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے

معاشرے کو پاک صاف کرنے اور انسانیت کو سنوارنے کے لئے
ایک کارآمد آلہ سمجھتے رہے اور اس لحاظ سے میرزا کا فن عوامی بھی
ہے منفرد بھی اور زندگی آمیز و زندگی آموز اقدار کا حامل بھی ——
میرزا ہمارے مضحکہ خیز معاشرے کے بے باک نقّاد بھی ہیں
اور ماہر جرّاح بھی —— وہ ان بوالعجبیوں کا محض مذاق ہی
نہیں اُڑاتے اپنے فن کے نشتروں سے عملِ جرّاحی بھی کرتے ہیں۔
وُہ طنز کی گہری چوٹ لگاتے ہیں لیکن توہین آمیز رویّہ اختیار نہیں
کرتے۔ نہ ہی واعظ یا ناصح بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تو صرف
حقائق کو بے نقاب کر کے غیر محسوس طور پر دعوتِ فکر دیتے ہیں۔
اور بس —— وہ ہماری ایسی حماقتوں کو روشنی میں لاتے ہیں جو
شب و روز ہم سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان پر غور کرنے کی
ہمیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ وہ مذاق مذاق میں ہماری دُکھتی رگوں کو
نہایت بیدردی سے چھیڑتے ہیں۔ اور تلخی کم کرنے کے لئے انھیں
یوں مضحک بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ہم
پہلے تو پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتے ہیں اور پھر اسے پہچان کر مرقعِ عبرت

بن جاتے ہیں۔ وہ ایک ماہر مصوّر کی طرح الفاظ کے ہلکے اور تیز رنگوں کی آمیزش سے مقصدیت کو اُبھارنے اور دیرپا بنانے کا ہُنر جانتے ہیں۔

میرزا کو زباندانی کا دعویٰ نہیں وہ الفاظ کے طوطے مینا بنانا نہیں جانتے۔ نہ ہی محاورے اور روزمرّہ پر عبور رکھنے کے دعوے دار ہیں۔ وہ تو ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کی نظر گہری اور بسیط ہے اور ایک چابکدست مصوّر کی طرح رنگوں کے استعمال پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ وہ رنگوں کا بدریغ جا و بیجا استعمال کرکے تصویر کا حُلیہ نہیں بگاڑتے بلکہ ہلکے اور لطیف رنگوں کے معمُولی اشارے سے تصویر کو گویائی عطا کرتے ہیں۔ اور اس میں وہ شوخی اور پُرکاری بھر دیتے ہیں کہ اس تخلیق کو جب بھی دیکھیے ایک نیا رُخ سامنے آتا ہے نیا حظ حاصل ہوتا ہے۔

میرزا تمام عمر دوسروں کو ہنساتے رہے۔ ان کے زخموں کا اندمال کرتے رہے لیکن خود اپنے زخموں کا مداوا نہ کرسکے۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں ——

کہ عوام کے دکھوں کو اپنی ظرافت سے لبھانے والا اور مشاعروں کو زعفران زار بنانے والا شاعر خود کس قدر دکھی تھا۔ ان کا اپنا سینہ زخموں سے چور تھا۔ اور ان کی زندگی غمِ حالات کے ناسوروں سے داغ داغ تھی۔ انھوں نے کبھی اپنے احباب پر بھی اپنے ذاتی دکھوں کا اظہار نہ کیا۔ اُنھوں نے اپنی دردناک زندگی کے کرب سے معمور چہرے پر ایک ایسا مصنوعی ماسک لگا رکھا تھا جو ہر وقت مسکراتا اور قہقہے لگاتا رہتا

میرزا کی زندگی کا ایک المیہ تو یہ تھا کہ حالات کی ستم ظریفی سے وہ تمام عمر شادی نہ کر سکے اور تجرّد کی زندگی گذار دی۔ دوسرا المیہ غمِ روزگار تھا جس نے زندگی بھر ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ تیسرا اور سب سے بڑا المیہ ان کا طویل اور ناقابلِ علاج دمہ کا مُوذی مرض تھا۔ جو انھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ان واقعات اور حالات نے انھیں چڑچڑا ضرور بنا دیا تھا۔ بات بات پر بھڑک اُٹھنا اور احباب سے روٹھ جانا ان کا معمول بن چکا تھا۔ لیکن فطری رجائیت نے انھیں قنوطیت کا شکار ہونے نہیں دیا۔ خصوصًا اُنھوں نے اپنے

فن کو اپنے ذاتی المیہ سے آلودہ ہونے سے ہمیشہ بچائے رکھا۔
ایک سچّے باشعور فن کار کی طرح انہوں نے غمِ ذات کو غمِ کائنات
میں سمو دیا۔ وُہ ہمیشہ اپنے عوام اپنے معاشرے اپنے ملک و قوم
اور تمام عالمِ انسانیت کی بہبُود اور فلاح کے لئے سوچتے اور لکھتے
رہے اور کبھی بھُول کر بھی اپنی ذاتی پریشانیوں کو اپنے فن پر
اثر انداز ہونے نہ دیا۔

میرزا محمود کم و بیش چالیس برس تک شاعری کرتے رہے
جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ ان کی ابتدا سنجیدہ شاعری سے ہوئی
لیکن بعد میں اُنھوں نے اسے ترک کر کے موجودہ رنگ اختیار کرلیا
قیامِ پاکستان تک اُن کی شہرت اپنے شہر کی چار دیواری تک محدود
تھی۔ ۱۹۴۸ء میں ہم نے پشاور سے مجلّہ "سنگِ میل" کا اجراء کیا
اس میں میرزا کا کلام شائع ہُوا تو بیرونی دُنیا سے ان کا تعارف ہُوا
پاکستان کے طول و عرض میں انھیں مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا
اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں ان کی دھُوم مچ گئی۔ پھر تو یہ
عالم تھا کہ کوئی بھی کل پاکستان مشاعرہ اُن کے بغیر کامیاب نہیں

سمجھا جاتا تھا۔

میرزا بڑے پُرگو شاعر تھے انھوں نے بہت کچھ لکھا جس میں سنجیدہ اشعار کا انبار بھی ہے۔ پشتو تراجم بھی ہیں منظوم پہیلیاں بھی ہیں اور اپنے مخصوص طنزیہ اور ظریفانہ رنگ میں نظموں غزلوں اور قطعات کا بہُت بڑا ذخیرہ بھی ہے اس میں سے اُن کے ابتدائی ظریفانہ کلام کا ایک مجموعہ "سنگینے" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوچکا ہے۔

میرزا کے کلام کی ترتیب و تدوین کی خدمت مجھے سونپی گئی۔ میرا اُن کا ۳۴ برس کا ساتھ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں میری اُن سے دائرۂ ادبیہ پشاور میں ملاقات ہوئی اور پھر ایسے قلبی تعلّقات قائم ہوئے کہ زمانے کے اتار چڑھاؤ اور گرم و سرد مطلق ان پر اثرانداز نہ ہوسکے۔ ہمارے یہ مخلصانہ تعلّقات ایکدوسرے کے احترام کی بنیادوں پر تھے۔ اِس لئے ہماری طویل دوستی کے ہموار سلسلے پر ان دوستوں کو تعجّب ہوتا تھا۔ جنھیں میرزا کی افتادِ طبع کا تجربہ ہوچکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میرزا مرحُوم میں بتقاضائے

بشریت بہت سی کمزوریاں تھیں اور ان کی بعض کمزوریاں تو ناقابلِ
برداشت بھی بن جاتی تھیں۔ لیکن میں نے انھیں ان تمام قباحتوں کے
ساتھ ایک ذہین فن کار اور مخلص دوست کے طور پہ قبول کرلیا تھا
اور اسی لئے وہ میرے لئے کبھی بار خاطر ثابت نہیں ہوئے۔ اس
طول وطویل رفاقت کے سفر میں مجھے میرزا کو نہایت قریب سے
دیکھنے انھیں سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کی کمزوریاں
بھی سامنے آئیں اور خوبیاں بھی نظروں سے گذریں۔ وہ منہ پھٹ
ضرور تھے لیکن ایک کھرے انسان کی طرح دل کے برے نہ تھے
وہ تن کی طرح من کو بھی اُجلا رکھنا چاہتے تھے۔ جو کچھ اندر ہوتا
الٹ کر من کو پاک کر دیتے۔ ان کی اس طہارت ہی سے مجھے پیار
تھا۔ اور یہی آپس کا پیار ہمارے نباہ کا باعث تھا۔ میں انکا مدّاح
بھی تھا اور ناقد بھی۔ میرزا پر تنقید کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن چند
ایک مزاج شناس دوست جن کی بات وہ برداشت کرلیتے تھے
ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ چنانچہ ان کا پہلا مجموعہ "سنگینے" طبع ہوا تو
اس میں سب رطب و یابس شامل کرنے پر میں نے ان پر سخت

نکتہ چینی کی۔ اگرچہ ایک مقامی اخبار میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہوئے میرزا کو رگیدا گیا تو میں نے ان کا دفاع کرتے ہوئے ایک طویل مضمون بھی لکھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے میری یہ نکتہ چینی برداشت کی بلکہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا۔

میرزا کے ایک دوست کے طور پر بھی اور ایک فنکار کے اعتبار سے بھی ہم پر بہت حقوق تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم زندگی میں ان کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد جو اس خدمت کا مجھے موقع ملا ہے اسے اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے ہوئے میں نے اُن کے کلام کا پوری توجہ اور دقّتِ نظر سے انتخاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ زیرِ ترتیب مجموعے میں صرف وہی نمائندہ کلام شامل کیا جائے جو میرزا کے خصوصی اندازِ فکر کا حامل ہے اور جو ان کے لئے وجہِ شہرت ثابت ہوا ہے۔ سنجیدہ کلام کے علاوہ مجھے ان کے قریب ایک تہائی ایسے ظریفانہ اور طنزیہ کلام کو بھی صرفِ نظر کرنا پڑا جو معیاری نہیں تھا یا میرزا کی بالغ نظری اور ثقاہت کے منافی تھا۔ ان کا کچھ ایسا کلام بھی رد کرنا پڑا جو فنّی اعتبار سے

وقیع ہونے کے باوجود بعض وجوہات کی بنا پر میرے نزدیک وہ اشاعت کے لئے موزوں نہیں تھا۔ یہ کلام دوسرے شعراء کی طرح میرزا نے بھی ترنگ میں آکر سرمستی کے عالم میں محض خوش طبعی کے لئے کہا۔ اور وہ خود بھی اس کی اشاعت کے حق میں نہیں تھے۔ کیونکہ انہوں نے خود ہی اسے قلمزد کر دیا تھا۔

صوبہ سرحد کے اس زرخیز خطے نے ہمیشہ بڑی بڑی جینئس علمی ادبی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اس سرزمین نے جہاں پشتو میں خوشحال خان خٹک۔ رحمان بابا۔ کاظم خان شیدا۔ حمید بابا اور فارسی میں معزاللہ خان مہمند۔ قاسم علی خان آفریدی۔ ادیب پشاوری اور رعنا کاظمی جیسے اولوالعزم شاعروں کو جنم دیا۔ وہاں اردو میں بطرس بخاری۔ مُلا رموزی۔ میرولی اللہ۔ قاضی محمد عمر قضا۔ جگر کاظمی اور میرزا محمود سرحدی ایسے نامور دانشور بھی پیدا کئے جن پر اردو ادب کی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

ان علمی ادبی شخصیتوں کی منفرد ادبی حیثیت نے غیر ملکی حکمرانوں کے اس افسون کو باطل کر دکھایا جو اُنھوں نے حریت پسند پختون قوم

کے خلاف اپنے زہریلے پروپیگنڈے کے ذریعے سارے برِصغیر
پاک و ہند میں پھیلا رکھا تھا جس کا مقصد اس خطّے کے بہادر باشندوں
کو اجڈ، وحشی، غیر مہذّب اور فنونِ لطیفہ سے عاری ثابت کرنا تھا
مُلّا رموزی اور بطرس کے بعد میرزا محمود اس سرزمین میں
اُردو زبان کا تیسرا ملک گیر شہرت کا حامل طنّاز مزاح نگار ہے۔
اور اس حیثیت سے تو وہ یکتا بھی ہے کہ دوسرے دونوں حضرات
طنز و ظرافت کے نثری میدان کے شہسوار تھے۔ اس رنگ میں نظم کا
فن مقابلتاً زیادہ مشکل ہے۔ لیکن میرزا نے اپنی خدا داد صلاحیتوں اور
مسلسل فنّی ریاضت سے اس دشوار گذار راہ کو نہایت کامیابی سے
طے کر کے نام و مقام پیدا کیا اور ثابت کر دکھایا کہ فن کسی کی میراث
نہیں اور یہ کہ پشتون صرف اپنی مادری زبان پشتو ہی نہیں اردو میں
بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دینے پر قادر ہیں اور فنونِ لطیفہ
سے اُنھیں اتنی ہی دلچسپی اور لگن ہے جتنی ملک کے کسی بھی دوسرے
حصّے کے دانشوروں کو ہو سکتی ہے۔

میرزا بلاشبہ ان ذہین اور فطین فنکاروں میں سے ہیں جو

فطری صلاحیتوں سے لدے پھندے وارد ہوتے ہیں اور اپنے فن میں وہ مقام رکھتے ہیں کہ ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ میرزا نے فن کی لگن میں اپنے آپ کو شمع کی طرح گھلایا اور شب و روز کی محنت اور ریاضت سے اپنی جان کو ایسا خوفناک روگ لگا لیا جو اندر ہی اندر گھن کی طرح انھیں چاٹتا رہا اور جس نے انھیں وقت سے پہلے ہی موت کے آغوش میں پہنچا دیا۔ لیکن اپنی فنی تخلیقات کا جو ترکہ انھوں نے چھوڑا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ انکی کاوشوں کو ہمارے ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کے باب میں میرزا محمود سرحدی کا نام روشنی کے مینار کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور وہ مر کر بھی سدا زندہ و پائندہ رہیں گے ـــ کہ

فنا تو میراث بے ہنر ہے

فارغ بخاری

۱۱۶ - گُل بہار کالونی - پشاور

۳ر جنوری ۱۹۷۰ء

نظمیں غزلیں

نگہم نقب بہ گنجینۂ دلہا می زد
مژدہ باد اہلِ ریا کہ زمیداں رفتم

۱۴ اگست
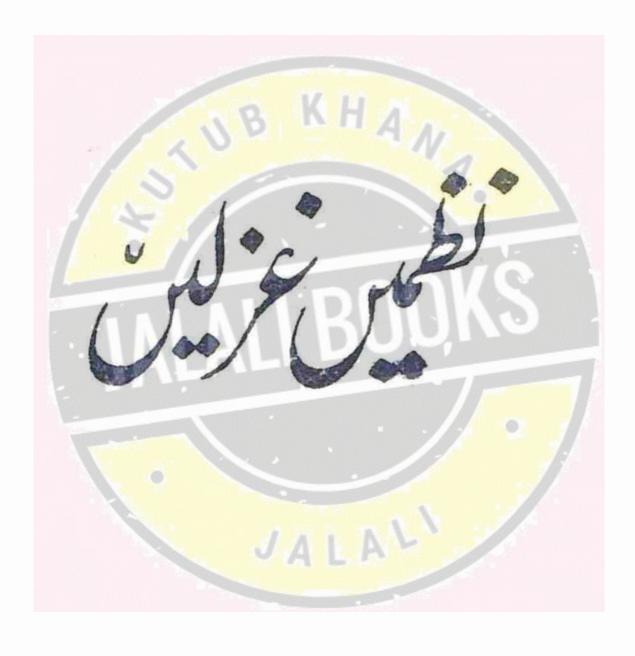
یوم آزادی ہے اور ہم ہر طرح آزاد ہیں
بیٹھ جائیں جس جگہ کوئی اٹھا سکتا نہیں

خواہ بھوکے ہیں تو کیا ہم خواہ ننگے ہیں تو کیا
پادشاہی پہ ہماری حرف آ سکتا نہیں

کیا یہ کم ہے اپنی دولت جاتی ہے اپنوں کے پاس
رشوتیں اب کوئی بیگانہ تو کھا سکتا نہیں

شکر ہے اب یہ تو کہہ سکتے ہیں ہم آزاد ہیں
گو ہمارے جاننے والے بڑے نقّاد ہیں

○

جن کا کوئی مقام ہو وہ کبھی　　دعویٰ برتری نہیں کرتے

اک حسیں روز ساتھ ہوتا ہے　　مستقل عاشقی نہیں کرتے

ہم اسے پوجتے ہیں اے زاہد　　کوئی سوداگری نہیں کرتے

دشمنی چاہتے نہیں ہیں ہم　　اس لیئے دوستی نہیں کرتے

اپنی قسمت کو رو رہے ہیں ہم　　بات کچھ آپ کی نہیں کرتے

جھوٹ ہوتا ہے سچ بھی ہوتا ہے
ہم بڑی شاعری نہیں کرتے

○

ایک دن ڈھونڈتے پھروگے ہمیں
کیوں مٹاتے ہو نقشِ پا کی طرح

ہم ادھر راہ دیکھتے ہی رہے
وہ گُذر بھی گئے ہَوا کی طرح

مجھکو معلوم ہے شراب ہے یہ
پی رہا ہوں مگر دَوا کی طرح

پھر بھی اپنا سکے نہ ہم ان کو
پوجتے تھے جنھیں خدا کی طرح

حوصلے ہیں کہاں امیروں کے
ہم گدایانِ بے نوا کی طرح

شادی کے بعد

جب وہ پہلے ملی تو چپ چپ تھی
اور مَیں تھا کہ بولے جاتا تھا

وہ دوبارا ملی تو میں چپ تھا
اور اسے بولنے کا چسکا تھا

ہوئی شادی تو دونوں چپ چپ تھے
بولنے والا صرف مُلّا تھا

پھر یہ عالم تھا دونوں بولتے تھے
اور سارا محلّہ سنتا تھا

○

میرا حال مجھ سے نہ پوچھئے اسے رہنے دیجئے راز میں
نہ میں کہہ سکونگا جو از میں نہ وہ سن سکیں گے جو از میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی نہ مکاں ملا نہ دکاں ملی
جو مکاں ملا تو دمشق میں جو دکاں ملی تو حجاز میں

کرم اے شہِ عرب و عجم ہے وہ روٹیوں کا پرابلم
کھڑے ہم ہیں ایسے قطار میں کہ کھڑے ہوں جیسے نماز میں

میری بات ہوتی ہے زہر سی تجھے کس طرح کہوں شیخ جی
کہ ہزاروں فتنے چھپے ہوئے ہیں تیری جبینِ نیاز میں

مال گودام روڈ

یوں تو میرے شہر میں سڑکیں کئی ہیں لازوال
لیکن اک ایسی سڑک بھی ہے نہیں جس کی مثال
اس کی چھاتی پر کئی ٹانگے الٹ کر رہ گئے
سینکڑوں گھوڑوں کا اس پر ہو چکا ہے انتقال
آس پاس اسکے جو بستے ہیں نہ ان کی پوچھئے
جس قدر ویراں ہے یہ، ہیں اسقدر وہ خستہ حال
رونقیں ہی رونقیں ہیں جس طرف بھی دیکھئے
چیخنے لگتے ہیں اس پر شام ہوتے ہی شغال
لاریاں پٹرول کی دیکھو گے اس پر صبح و شام
ورنہ انساں تو نظر آتا ہے اس پر خال خال
اس میں ایسی کھائیاں ہیں ایسے ایسے غار ہیں
دفن ہو سکتا ہے جن میں آدمی بعد از وصال

ڈگمگا جاتے ہیں ریڑھے لڑکھڑا جاتی ہے جیپ
واپس آجائے سلامت سائیکل کی کیا مجال

مینہ برس جائے تو چل سکتی ہیں اس پہ کشتیاں
ڈوب جانے کا بھی ہو جاتا ہے اکثر احتمال

بھول ہی جاتا ہے اس پر اپنا منصب آدمی
مور کی چلتا ہے کوئی اور کوئی کوّے کی چال

سال کے بارہ مہینے اس پہ کیچڑ کی بہار
ختم ہونا غیر ممکن، سوکھنا اس کا محال

اس کی ڈھلوانوں پہ موٹر کا دھڑک جاتا ہے دل
اس کے موڑوں پر لرز جاتے ہیں اکثر باکمال

اس پہ جانے کا کبھی ہوتا ہے جس کو اتفاق
اس کے لوٹ آنے کا پیدا ہی نہیں ہوتا سوال

سوچتا رہتا ہوں کب میرے وظیفے کی طرح
اس کی بدحالی کا آتا ہے حکومت کو خیال

○

زمانہ کچھ بھی کہے اس کا احترام نہ کر
جسے ضمیر نہ مانے اُسے سلام نہ کر

پرکھ سکے تو پرکھ لے اسے یہ دِل ہے مرا
ہے اس میں دولتِ کونین اِسکے دام نہ کر

شراب پی کے بہکنا ہی ہے اگر تو نہ پی
حلال چیز کو اِس طرح سے حرام نہ کر

جو ہو سکے تو کبھی ہنس کے بول لے ہم سے
کلام کی کوئی حاجت نہیں کلام نہ کر

○

لوگ جن کے ستم کو روتے ہیں
ہم کو انکے کرم نے مار دیا

اِک حسیں بھی نہ بن سکا اپنا
گو زمانے میں اشتہار دیا

وقت جتنا صنمکدے سے بچا
میکدے میں اُسے گزار دیا

ان کو مجبور دیکھتا ہوں میں
جن کو قدرت نے اختیار دیا

کچھ تو یوں بھی حسیں ہے وہ محمود
کچھ اداؤں نے بھی نکھار دیا

○

کتنے ہی ہمیں ان میں سخنداں نظر آئے
جتنے بھی یہاں بے سر و ساماں نظر آئے

آتا نہ تھا کہنے کا یقیں ان کو ہمارے
آئینہ جو دیکھا تو وہ حیراں نظر آئے

کیا کیا نظر آیا نہیں اس دَور میں ہم کو
کپڑوں میں بھی انساں ہمیں عریاں نظر آئے

قاصد نے کہا منہ سے تو خاموش رہے پر
خط پڑھ کے تمھارا وہ پریشاں نظر آئے

آتا نہ تھا باتوں کا سلیقہ جنھیں وہ بھی
در تک ترے پہنچے تو غزل خواں نظر آئے

ملتی ہے کہاں دولتِ اخلاص نہ پوچھو
مے خانے میں آؤ تو میری جاں نظر آئے

روزوں میں بھی کرتے ہیں طواف اُس کی گلی کا
شاید کہ وہ غارت گرِ ایماں نظر آئے

کسان کی فریاد

حضور! دیکھئے تو ہم پہ کیا گذرتی ہے
حضور سنئے تو دلچسپ سا فسانہ ہے

حضور! جن سے بھی ہم نے کہا ہے دکھ اپنا
وہ یہ سمجھتے رہے ہیں کہ یہ ترانہ ہے

حضور! اپنی زمینیں اگرچہ بنجر ہیں
مگر ہمارے مقدّر میں آبیانہ ہے

حضور! ایک تو یہ ٹیوب ویل نہیں چلتے
پھر اس پہ پانی کے بل کا بھی تازیانہ ہے

حضور! ہم تو کمیٹی کی حد سے باھر ہیں
تو پھر یہ ٹیکس کا کیسا یہ شاخسانہ ہے

حضور! اپنی سمجھ سے یہ بات باہر ہے
ہمارا جھونپڑا کیونکر غریب خانہ ہے
حضور! آپ کے عامل ہمارے افسر ہیں
سلوک آپ کا گرچہ مساویانہ ہے
یہ سب سطا لیے ہم پر زیادتی ہے حضور!
ہماری زندگی پہلے قلندرانہ ہے

○

اب وہ خود اپنی جگہ مدعی بن بیٹھے ہیں
ہم نے آگاہ کیا تھا جنھیں غم سے اپنے

مفتیٔ شہر کے ارشاد پہ سب فتوے ہیں
شیخ صاحب بھی ہیں مجبور شکم سے اپنے

وقت کی بات ہے دیکھا نہ انھوں نے مڑ کر
ہائے وہ لوگ جو تھے سات، جنم سے اپنے

تجھ کو معلوم نہیں ہم بھی خدا رکھتے ہیں
دل میں آتا ہے کہ کہہ دیں یہ صنم سے اپنے

آپ کے حسن کے چرچے ہیں جہاں میں سچ ہے
دھوم ہم نے بھی مچائی ہے قلم سے اپنے

○

اب کفن کے لئے بھی پرمٹ ہے
اب وہ آرائشِ لباس کہاں!

جانتے ہو کہ چینی مہنگی ہے،
میری باتوں میں اب مٹھاس کہاں؟

اتنا وسواس بھی نہیں اچھا
میری بیوی نہیں تو ساس کہاں؟

میکدے بند ہو گئے محمودؔ
اب صراحی کہاں، گلاس کہاں؟

پرائمری سکول

ایک میرا ہی مکاں قابل تعمیر نہیں
ریتی دروازے میں بچوں کا اک اسکول بھی ہے
نہیں بچوں کی اچھل کود پہ موقوف کوئی
خود بخود چھت کے بچک جانے کا معمول بھی ہے
دیکھنا تو ذرا کوٹھے کی منڈیروں کی طرف
کہ کہیں نام کو ہیں اور کہیں ہیں ہی نہیں
اک طرف ایک دریدہ سی چٹائی ہے بچھی
جس پہ بیٹھے نظر آتا ہے ہر اک خاک نشیں
سامنے دیکھو تو تمباکو کے گودام بھی ہیں
کھیلتے جس کے مقابل میں ہیں لڑکوں کے پرے
ایک جانب کو ہے نالہ بھی رواں پانی کا
اب جو لڑکوں کو پڑھائے وہ حفاظت بھی کرے

سیڑھیوں میں جو گڑھے ہیں تو ہیں کوٹھے پہ گڑھے
گو بچارے طلبا، روز انھیں بھرتے ہیں
مستری جب بھی گزرتے ہیں تو اکثر اس کے
"در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں"

ڈھیر کوڑے کا بھی ہے سامنے اس کے جس سے
اٹھتا ہے ایسا تعفّن کہ بس اللہ کی پناہ
مجھ کو ان لوگوں کی ہمّت پہ تحیّر ہو نہ کیوں
یہاں بچّوں کو پڑھاتے ہیں، جو ناکردہ گناہ

مشاعرے

مشاعرے نہیں ہوتے تو کیوں نہیں ہوتے

کل ایک دوست نے یہ اتّفاق سے پوچھا

کہا یہ مَیں نے کہ تفصیل اس کی لمبی ہے

مگر مَیں تجھ کو بتاتا ہوں حال تھوڑا سا

خدا کے فضل سے اب قحط بھی نہیں ہے کہیں

کسی جگہ کوئی سیلاب بھی نہیں آیا

نہ جب وبا کہیں پھوٹے نہ زلزلہ آئے

مشاعرے ہوں تو پھر کس خوشی میں ہوں یہ بتا

ناگفتنی

ہے پیار ان جوانوں سے اقبالؔ کو
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یہ سچ ہے مگر وہ جواں اب کہاں
عزائم تھے جن کے یہاں تک بلند

جو ہیں بھی تو بالفرض یہ جانئے
ہیں شیروں کے ملبوس میں گوسفند

سبق بھولتے گر نہ اجداد کا
زبوں حال ہوتے نہ یوں دردمند

یہ حالت ہے ان کی بقولِ کسے
نشستند و گفتند و برخاستند

○

ترقیوں پر ترقیاں ہیں ڈگریوں پہ ڈگریاں

پاس کرتا جا رہا ہوں امتحاں پر امتحاں

اب تو ہم پر رحم کر اے خالقِ کون و مکاں

دیکھ بندے بھی نرے کرنے لگے رزّاقیاں

آج جو حالات ہیں دنیا کے وہ پہلے نہ تھے

ہم نے دیکھے ہیں ہزاروں انقلابِ آسماں

چاک تھا جب پیرہن مجنوں کا وہ دن اور تھے

اب تو مجنوں پر بھی ہو جاتا ہے لیلےٰ کا گماں

کیا عجب پردہ نشینی بھی وہ کر لیں اختیار

عورتوں کی طرح ہیں جن کے سروں پر چوٹیاں

پرانی غزل

خیال و فکر کی محفل سجا رہا ہوں میں
ہنسا رہا ہوں کسی کو رلا رہا ہوں میں
طرح طرح کے کرشمے دکھا رہا ہوں میں
سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں

وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

ہر ایک شخص کو لکھوا چکا ہوں میں اسکو
ہر ایک شہر میں دہرا چکا ہوں میں اسکو
بطور تحفہ بھی بھجوا چکا ہوں میں اس کو
سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں

وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

ہزار بار اسے سن چکے ہیں مجھ سے عوام
یہ سامعین کو اب یاد ہو چکی ہے تمام
ازل سے تا بہ ابد ہے یہ میرا تازہ کلام
سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں

وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

نہیں ہے کوئی بھی مدّاح بے سبب اسکا
بجائے خویش ہے مصرع ہر اک غضب اس کا
خیال ہے کہ میں بیمہ کراؤں اب اس کا
سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں

وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

اسی غزل نے میری دھوم بھی مچائی ہے — جہاں بھی میں نے سنائی ہے داد پائی ہے
خبر نہیں ہے کسی کو کہ یہ پرائی ہے — سنو سنو کہ قیامت اٹھا رہا ہوں میں
وہی پرانی غزل پھر سنا رہا ہوں میں

○

اس کو کہتے ہیں گردشِ ایّام — بھول بیٹھے ہیں اپنا طرزِ کلام

اب تو آزادیاں ملی ہیں ہمیں — اب نہ باقی رکاب ہے نہ لگام

شوقِ اولاد باعثِ اولاد — ماسوا اِس کے کوئی فکر نہ کام

بیویاں بے حجاب بے پردہ — اور جلو میں ہیں شوہرانِ کرام

سود کے مال پر ہر اِک جانب — بٹ رہی ہے زکوٰۃ برسرِ عام

ماسوا آج اہلِ ثروت کے — بادہ خواری ہے ہر کسی پہ حرام

حج کی دولت ہے اور سونا بھی
آم کے آم گٹھلیوں کے دام!

روشِ زمانہ

آ ذرا قوم کی خدمت بھی کریں
جمع اپنے لئے دولت بھی کریں

آ ذرا تھوڑا سا چندہ کر لیں
آ ذرا پیٹ کا دھندا کر لیں

آ ذرا جیل کے در تک ہو آئیں
آ ذرا تھوڑے سے لیڈر بن جائیں

آ وطن ہی میں مسافر کہلائیں
آ کہ یو پی کے مہاجر بن جائیں

○

سفارش چل سکے جن کی نہ پرمٹ مل سکے جن کو
ذرا سوچو کہ وہ کیونکر کہیں عہدِ بہار آیا

ہمیں اے گردشِ ایام وہ دن یاد ہیں اب تک
ادھر خط ہم نے بھیجا اور ادھر سے ان کا تار آیا

خدا کی شان تو دیکھو مجھے ممبر سمجھ بیٹھا
الیکشن کے دِنوں میں جس حسیں پر ہم کو پیار آیا

میں اپنے دوسرے بیٹے کو لندن کس طرح بھیجوں
کہ پہلا جامۂ انسانیت جا کر اتار آیا

قیامت ہے کہ لیڈر نے قسم قرآن پر کھائی
ستم یہ ہے کہ دنیا کو نہ پھر بھی اعتبار آیا

گل بہار کالونی

اس طرف بسوؤں کے میلے ہیں　　اس طرف مچھروں کے ریلے ہیں
جتنی کاریں ہیں اور سڑکوں پہ　　تیری سڑکوں پہ اتنے ٹھیلے ہیں
اے میری گل بہار کالونی!

کوئی سمجھے کہ ابر چھایا ہے　　خاک اور دھول اتنی اڑتی ہے
اور یہ معلوم ہی نہیں ہوتا　　یہ گلی کس طرف کو مڑتی ہے
اے میری گل بہار کالونی

بعض گھر رومیوں کی صورت ہیں　　بعض گھر کاشغر کے نقشے پر
بعض گھر تو ہیں کوٹھیوں کی طرح　　بعض ہیں میرے گھر کے نقشے پر
اے میری گل بہار کالونی

دیکھتا ہی نہیں کبھی بالکل اور کبھی تا بہ دیر دیکھتا ہے
اپنی تقدیر دیکھ کر اکثر تیری گلیوں کے پھیر دیکھتا ہے

اے میری گل بہار کالونی

تجھ میں وہ گندا نالہ بہتا ہے مچھروں کی جو راجدھانی ہے
تیری دوری کو دیکھتا ہوں میں تو پشاور کا کالا پانی ہے

اے میری گل بہار کالونی

لوٹ کر پھر وہ گھر نہیں آتا جس کا بچہ سکول جاتا ہے
ہے کسی جا مشابہت اتنی آدمی گھر بھی بھول جاتا ہے

اے میری گل بہار کالونی

باوجود اتنے حادثات کے بھی تجھ میں کلیاں دلوں کی کھلتی ہیں
شاعری بھی ہے تجھ میں فارغ بھی دونوں چیزیں اکٹھی ملتی ہیں

اے میری گل بہار کالونی

روزے

سن رہے ہو روزہ خورو آگیا ماہِ صیام

یعنی اسے اللہ کے چورو آگیا ماہِ صیام

تم سے ہو سکتا ہے آخر کیا کسی کو اختلاف

تندرستی کے مریضو تم کو سب کچھ ہے معاف

ہم تو واقف ہوئے ہیں گرچہ سب پہ ہے عیاں

اس مہینے گھیر لیتی ہیں تمھیں بیماریاں

اِس مہینے ہسپتالوں میں نظر آتے ہو تم

یہ بھی سنتے ہیں کہ کھانا بھی وہیں کھاتے ہو تم

آجکل تو اسے جواں مردو وہ ہوٹل بھی ہیں عام

ہے تمھارے واسطے پردے کا جن میں انتظام

روزہ خورو تم سے جو ہوگا وہ تم پر ہے عیاں

اب ذرا کچھ روزہ داروں کی بھی سن لو خوبیاں

جھوٹ کہنا صبح سے تا شام ان کا کام ہے

ان کے اپنے نرخ ہیں اور ان کا اپنا دام ہے

مردم آزاری یہ کرتے ہیں مگر روزے سے ہیں

چور بازاری یہ کرتے ہیں مگر روزے سے ہیں

بیچتے ہیں بھاؤ پر بکرے کے بھینسا دیکھیے

چشم عبرت کھولئے اور ان کا تقوی دیکھیے

لطف جب ہے ہو مسلط ان پہ اک اک اہلکار

پھر خیال آتا ہے ان میں بھی ہیں اکثر روزہ دار

○

میرے چارہ ساز تجھ سے میرا کیا علاج ہو گا
تو میرے جنوں پہ گریاں ہیں تری خرد پہ خنداں

میرا حال یوں نہ پوچھو مجھے مے پلا کے سن لو
نہ سنا سکوں گا ہرگز بہ طریقِ ہوشمنداں

مجھے اب ترا تصور بڑا کام دے رہا ہے
مجھے اب نہیں رہی ہے تیری احتیاج چنداں

ہمیں رسمِ عید قرباں تو منانی ہی پڑے گی
کہ ہماری سرحدوں پر ہے ہجومِ گوسفنداں

مجھے خانگی وبالوں سے کوئی غرض نہیں ہے
نہ خیالِ نورچشماں نہ سوالِ ارجمنداں

میں کسی پر بھی مبتلا نہ ہُوا

مجھ سے تو شکوۂ جفا نہ ہُوا — ان کا وعدہ کبھی وفا نہ ہُوا
میں کسی پر بھی مبتلا نہ ہُوا — دردِ منّت کشِ دوا نہ ہُوا
میں نہ اچھّا ہُوا بُرا نہ ہُوا

جب سے دعوائے لب کشائی ہے — جس سے سنئے مری بُرائی ہے
میرے اللہ تری دہائی ہے — کیا یہ نمرود کی خدائی ہے
بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا

ہر جگہ قسمت آزمائی کی — پھر بھی اپنوں نے بیوفائی کی
میں نے کشمیر پر چڑھائی کی — جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

داد کس سے سخن کی جا کر پاؤں — کس کو سینے کے زخم جا کے دکھاؤں
یہی بہتر ہے اب ترانے سناؤں — مَیں کہاں قسمت آزمانے جاؤں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا

اپنی عادت ہے، جاں لٹانے کی
یعنی قدموں پہ خوں بہانے کی
مجھکو عادت نہیں ہے گانے کی
ہے خبر گرم ان کے آنے کی

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا

ہاتھ باندھے کھڑا ہوں تیرے قریب
مَیں ہوں بیمار اور تو ہے طبیب
پھر بھی کس درجہ بات ہے یہ عجیب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہُوا

تم سے شکوہ تھا ہم غریبوں کو
اور لے آئے تم ادیبوں کو
کیا خبر تھی یہ بدنصیبوں کو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

اِک تماشا ہُوا گِلا نہ ہُوا

کچھ بھی ہو رنج دل پہ سہتے ہیں
یہ نہیں ہے کہ اشک بہتے ہیں
مُسکراتے ہیں ہنستے رہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہُوا

○

میرے پاس آ کے بیٹھے تو غزل تجھے سناؤں
کسی بات پر ہنساؤں کسی بات پر رلاؤں

میری بیخودی پہ واعظ نہ یہ تبصرے ہوں تیرے
اگر اک جھلک میں اسکی تجھے دُور سے دِکھاؤں

وہ جو تھے حکیمِ مشرق - میری قوم کے جوانو!
وہ جگا سکے نہ تم کو تو مَیں کس طرح جگاؤں

میری بات کو ہمیشہ سے ہنسی سمجھنے والے
مجھے دِل یہ کہہ رہا ہے تجھے آئینہ دکھاؤں

کچھ عجب نہیں کہ شاعر بھی کہے مشاعروں میں
میرے شعر سُننے والو، میں پڑھوں کہ گنگناؤں

○

مجھ کو خاموش رہنے دے زاہد
جانتا ہوں میں پارساؤں کو

بن رہے ہیں مرید غیروں کے
کیا کہوں اپنے پیشواؤں کو

لطف جب ہے کہ واسطہ پڑ جائے
بے وفاؤں سے بے وفاؤں کو

جیب میں زر نہ ہو تو پھر محمود
کون سنتا ہے التجاؤں کو

خادمِ قوم

جاری کرتے تھے مرے نام پہ وارنٹ جو لوگ
ناطقہ بند ہے اب ان کا مرے ہاتھوں سے

میرے پیچھے کبھی پولیس پھرا کرتی تھی
اب مقرر ہے مرے بنگلے پہ پولیس کا گارڈ

کبھی پٹواری بھی ڈرتا تھا مجھے ملنے سے
اب کمشنر کے لئے فخر ہے ملنا میرا

قوم سر دھنتی تھی سن کر مرے نالوں کو کبھی
اب گورنر کو مری باتوں پہ وجد آتا ہے

جیل خانہ کبھی ہوتا تھا مرا صدر مقام
اب کبھی کوہ مری ہے تو کبھی نتھیا گلی

پہلے کہتے تھے مجھے خاک نشیں اہلِ وطن
اب مجھے کرسی نشیں صوفہ نشیں کہتے ہیں

نام سے پہلے تھا مرقوم مرے خادمِ قوم
اب مرے نام کے بعد ہوتا ہے صاحب کا لقب
شک نہیں ہے میں کبھی قوم کا خادم تھا مگر
خدمتِ قوم کی حد بھی کوئی ہوتی ہے ضرور

O

سادگی دیکھئے رونا کبھی لیلےٰ کے لئے
کبھی محمل کی سجاوٹ پہ فدا ہو جانا

لیڈری کے لئے اب شرط یہی ہے کافی
قید ہوتے ہی ضمانت پہ رہا ہو جانا

جانتا ہوں کہ کسی دن مجھے لے ڈوبے گا
دیکھ کر ان کو مرا نغمہ سرا ہو جانا

کہہ رہے ہیں وہ جنازے پہ مرے اک اک سے
"درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا"

جذبِ صادق ہے کہ ہے میرے وظیفے کا اثر
آپ کا اس طرح پابندِ وفا ہو جانا

سوچتا ہوں کہ حشر کیا ہوگا — دیکھتا ہوں تری اداؤں کو

مجھکو خاموش رہنے دے ناصح — جانتا ہوں میں پارساؤں کو

بن رہے ہیں مرید غیروں کے — کیا کہوں اپنے پیشواؤں کو

لطف جب ہے کہ واسطہ پڑ جائے — بے وفاؤں سے بیوفاؤں کو

ہاں کوئی حوصلہ نہ رہ جائے — میں نے بخشا تری خطاؤں کو

جیب میں زر نہ ہو تو پھر محمود
کون سنتا ہے التجاؤں کو

کنٹرول

بر سرِ پیکار تھی شاہنشہی — اور غریبوں کی مرمت ہوگئی

چائے اور چینی کو اب کیا روئیے — آٹے میں بھی جو کی شرکت ہوگئی

تیل پر مٹّی کے ڈالو خاک اب — ماچسوں پہ بھی قیامت ہوگئی

ریزگاری ہے نہ اب وہ روزگار — نوٹ کی پیسے کی عزت ہوگئی

کیا کہیں وجہِ لباسِ کھنگی — مختصر یہ ہے کہ عادت ہوگئی

اِک کفن اور دفن ہے سرکاری اب — اور جو ہونی تھی حالت ہوگئی

کی اگر محمود ایسی شاعری

بس سمجھ لیجو ضمانت ہوگئی

○

جذبۂ شوق والہانہ ہے
عشق ہے اور غائبانہ ہے

میری دانست میں تو اے ساقی
ساری دنیا شراب خانہ ہے

دیکھنا چاہتا ہوں لندن کو
حج کو جانا تو اِک بہانہ ہے

ڈاڑھی مونچھیں منڈا کے فرمایا
کیا کریں آخری زمانہ ہے

بھول کر ہی کبھی سے چلے آؤ
راستے میں غریب خانہ ہے

میرے ان کے تعلقات نہ پوچھ
دشمنی ہے نہ دوستانہ ہے

دِل کی کھیتی اجڑ گئی محمودؔ
مالیہ ہے نہ آبیانہ ہے

نوکری

گر میسر گورنری ہوتی — نوکری پھر بھی نوکری ہوتی

نوکری ہے کہ ہے ضمیر کشی — نوکروں کو کہاں نصیب خوشی

زندگی مستقل عذاب ان کی — پوچھ مت حالتِ خراب انکی

پوچھتے کیا ہو ان کے ایماں کی — بندگی کرتے ہیں یہ انساں کی

سارے حالات کس طرح لکھوں

کیونکہ فی الحال خود بھی نوکر ہوں

○

فسانے کی صورت میں احوال اپنا
سناتا ہوں ان کو بہانے بہانے
ہم عرضِ تمنّا کیے جا رہے ہیں
وہ سمجھے نہ سمجھے وہ مانے نہ مانے
غریبوں کی قسمت میں مزدوریاں ہیں
عجب تیری قدرت کے ہیں کارخانے
نہ ہم سے کہو رہنماؤں کی حالت
جو لندن کو جاتے ہیں حج کے بہانے
محبّت کا معیار ہے آج دولت
مہیّا کروں اب کہاں سے خزانے

○

بعد مدّت کے حضور ایک غزل لکھّی ہے

آپ کی جان سے دور ایک غزل لکھی ہے

شیخ جی ہم نے مجازی ہیں زمیں پر دھوئیں
آپ نے تو سرِ طور ایک غزل لکھی ہے

گن گنایا ہے تصوّر میں ترے پھر ہم نے
پی کے پھر بادۂ نور ایک غزل لکھی ہے

تو نے للچا کے ہمیں دیکھا ہے وہ کہتے ہیں
اس لئے تو نے ضرور ایک غزل لکھی ہے

اپنی تقصیر کا پوچھا تو وہ بولے تو نے
سَو قصوروں کا قصور ایک غزل لکھی ہے

کوئی زندوں میں سخن فہم نہیں کس کو سنائیں
ہم نے اے اہلِ قبور ایک غزل لکھی ہے

حقیقت

خدا جانے وہ لیڈر کیوں مجھے مخبر سمجھتا ہے
میری تنخواہ سے بڑھکر جسے ملتا ہے روزانہ

یہ فیشن ہے کہ جدت ہے جو گھر کو گھر نہیں کہتے
کوئی کہتا ہے منزل کوئی مسکن کوئی کاشانہ

جہاں تعلیم کا مقصد ہی محکومی ہو غیروں کی
وہاں لوگوں کی ذہنیت نہ ہو کیونکر غلامانہ

خدا جانے کہ میں حق پر ہوں یا سٹھیا گیا زاھد
میں کہتا ہوں کہ کالج ہے وہ کہتا ہے صنم خانہ

جسے کہتے ہیں محمل آج کل فیشن سے خارج ہے
سرِ بازار لیلےٰ پھر رہی ہے بے حجابانہ

مری رودادِ غم کیا پوچھتے ہو پوچھنے والو
حقیقت کی حقیقت ہے یہ افسانے کا افسانہ

○

آج بھی زُلف کے رخسار کے افسانے ہیں
کل بھی دیوانے تھے ہم آج بھی دیوانے ہیں

تیری فرمائشیں مانا کہ نہیں ہیں، لیکن
ٹیکس کی شکل میں اب بھی کئی جرمانے ہیں

ہم اگر ہوش میں ہوتے تو سمجھ بھی سکتے
کیا بتائیں تیری آنکھیں ہیں کہ مے خانے ہیں

میرے محبوب تجھے یہ بھی خبر ہے کہ نہیں
کچھ تخلّص کی رعایت سے بھی پروانے ہیں

○

کیا خبر ہے کہ گزاریں گے کہاں عید اب کے
مفتیٔ شہر پہ گر بیٹھے ہیں تنقید اب کے

نامہ بر خود بھی نہ آئیگا جو لایا نہ جواب
میں نے اس طرح سے کی ہے اسے تاکید اب کے

یاد ہیں پہلے الیکشن کے رو پہلے وعدے
کیا کریں خادمِ ملت تیری تائید اب کے

بے پڑھے رہ ہی نہ سکتے تھے وہ محمود اسے
تھی کچھ ایسی میرے مکتوب کی تمہید اب کے

○

ان مساجد کو تو سب اہلِ غرض جاتے ہیں

جب تو ہم کوئے خرابات میں پڑھتے ہیں نماز

ایک ہی سجدے میں کر دیتے ہیں ہم لوگ سحر

جب کبھی تیرے خیالات میں پڑھتے ہیں نماز

شیخ جی ہوش جہاں تیرے ٹھکانے نہ رہیں

ہم کبھی ایسے مقامات میں پڑھتے ہیں نماز

میں مسلماں جو نہ ہوتا تو بتا بھی دیتا

لوگ اب کون سے حالات میں پڑھتے ہیں نماز

ہم عبادت میں نمائش کے نہیں ہیں قائل

کیا کہیں کون سے اوقات میں پڑھتے ہیں نماز

○

لوٹ تھی لوگ ادھر مالِ جہاں تک پہنچے
ہم ادھر مے کدہ سے کوئے بتاں تک پہنچے

درد وہ درد نہیں جس کا مداوا ہو جائے
شکوہ وہ شکوہ نہیں ہے جو زباں تک پہنچے

کرفیو شہر میں ہر ایک طرف تھا نافذ
باوجود اس کے بھی ہم تیرے مکاں تک پہنچے

ریڈیو والے کہیں اس سے بھی آگے ہیں بہت
جھوٹ اخبار نویسوں کا جہاں تک پہنچے

اس کو کہتے ہیں ترقّی کے مدارج محمودؔ
گھر سے ہوٹل کو تو ہوٹل سے دکاں تک پہنچے

○

بھول بیٹھے ہیں اپنا طرزِ کلام
کتنے آزاد ہو گئے ہیں غلام

اور اک بار مسکرا دیجے
اس سے بڑھ کر نہیں کوئی انعام

تیری خاطر ہمیں گوارا ہے
کوئی بہتان ہو کوئی الزام

شیخ جی سوچتے ہیں کیا ہوگا
ہم بھی بدنام آپ بھی بدنام

ہو اگر اختیار تو محمودؔ
بادہ خواری نہ جرم ہے نہ حرام

جشنِ آزادی

جھوٹ ایمان کا زیاں ہے حضور
کچھ دکانیں کھلی ہوئی تھیں ضرور

کچھ گھروں پر چراغ روشن تھے
واقعی بعض لوگ تھے مسرور

ایک جلسے کا اہتمام بھی تھا
جس طرح سے کہ عام ہے دستور

جوق در جوق ہر طرف تھے رواں
شہر بھر کے ہزارہا مزدور

ایک تقریبِ افتتاح بھی تھی
جمع تھے جس میں سارے اہلِ شعور

بٹ رہی تھیں اگرچہ آپس میں
چند دیگیں مگر پکی تھیں ضرور

اک سڑک تو کچھ اتنی روشن تھی
جس پہ قرباں ہو شبِ دیجور

اس کو کہتے ہیں جشنِ آزادی
بات آخر یہ کیا ہے ربِّ غفور

○

وہی آئین[1] ہے وہی دستور
ہم بدستور کہہ رہے ہیں حضور

گرچہ اظہارِ حق سے ہیں معذور
پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ کہیں گے ضرور

آپ شرمندہ ہو رہے ہیں عبث
آپ کی ہر خطا، ہمارا قصور

اہلِ زر ہیں خدا کے ہمسائے
ہم ہیں مزدور ہم خدا سے دور

حالِ دل کس طرح کہیں محمودؔ
پہلے ناچار تھے تو اب مجبور

---

[1] ری پبلکن دور میں نیا آئین بننے پر۔

مر گئے تو کمال کیا ہو گا
یعنی ان کو ملال کیا ہو گا

جانے سمجھا ہے ہم نے کیا دل میں
جانے اُن کو خیال کیا ہو گا

اَے ریاکار کیا خبر تجھ کو
مے کشوں کا مآل کیا ہو گا

جل گئیں کشتیاں تو مت پوچھو
ناخداؤں کا حال کیا ہو گا

ہم فقیروں سے پوچھتے کیا ہو
جانتے ہو سوال کیا ہو گا

○

واسطہ انکو مجھ سے ہو کہ نہ ہو
میرے اشعار گنگناتے ہیں

شیخ صاحب کو وجد آتا ہے
جب گنہگار گنگناتے ہیں

اشک رکتے نہیں ہیں جب اپنے
چار و نا چار گن گناتے ہیں

موت کی دھمکیاں نہ دو ان کو
جو سرِ دار گن گناتے ہیں

ہم کلرکوں کا حال مت پوچھو
ہم ہر اتوار گن گناتے ہیں

مسلمانانِ الجزائر

الجزائر کے مسلمانو! خبر بھی ہے تمہیں
شمع آزادی کے پروانو! خبر بھی ہے تمہیں
چین آتا ہے کسی طور نہ آرام ہمیں
فکر رہتی ہے تمہاری سحر و شام ہمیں
سوچتے ہیں کہ تمہارے لئے کیا کام کریں
یہ تو ہم سے نہیں ممکن کہ وہاں جا کے مریں
لڑنے مرنے سے جو بالفرض نہ ہم یوں ڈرتے
آج کشمیر پہ ہندو نہ حکومت کرتے
مالی امداد میں سچ ہے بڑے مشہور ہیں ہم
لیکن اب ٹیکس ہی اتنے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

تھا دعاؤں پہ ہمیں آسرا وہ بھی نہ رہا
کیونکہ ان کا بھی اثر ہوتا ہے اکثر الٹا

احتجاجوں کے لئے کہئے تو انکار نہیں
ورنہ ہم لوگ کسی حال میں تیار نہیں
ہم سے تو بس یہی ممکن ہے کہ تقریریں کریں
یا فرانسیسیوں کے ظُلم کی تفسیریں کریں
اور تم لڑتے رہو لڑتے رہو لڑتے رہو

○

بیٹھے رہتے ہیں سامنے جب تک
مجھ کو جب تک سرور رہتا ہے

پاس آ کر وہ بیٹھتے ہیں مگر
فاصلہ کچھ ضرور رہتا ہے

میکدہ وہ مقام ہے کہ جہاں
آدمی باشعور رہتا ہے

اس کو صوم و صلوٰۃ سے مطلب
جو تمہارے حضور رہتا ہے

تیری آغوش میں جو ہوتا ہے
سو بلاؤں سے دور رہتا ہے

○

اہلِ دانش کے لئے کرسیاں مخصوص نہیں
آج اولاد کو پڑھوانے کی تکلیف نہ کر

اب تو جانے کو ہے بیمارِ غمِ ہجر ترا
اب عیادت کیلئے آنے کی تکلیف نہ کر

کوئی فریاد سنانے کا ذریعہ ہے تو خیر
ورنہ درخواست کے لکھوانے کی تکلیف نہ کر

کھو دیئے ہوش مرے ریشمی برقعے نے ترے
اب اسے چہرے سے سرکانے کی تکلیف نہ کر

منٹو[1]

درِ فردوس پہ رضواں نے کہا منٹو سے
جانتا ہوں کہ ازل ہی سے تھا تو مست والست

لیکن اِس بات پہ حیراں ہوں تری موت کے بعد
آج اونچا تجھے کہتے ہیں جو کل کہتے تھے پست

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے بہت سوچا ہے
کس طرح کرتے ہیں تسلیم یہ آج اپنی شکست

کہا منٹو نے یہ ہنس کر کہ کہوں کیا تجھ سے
ہیں مری قوم کے افراد یونہی مردہ پرست

---

[1] سعادت حسن منٹو۔

○

اہلِ زر پھر کبھی قلّاشوں کو کافر نہ کہیں
میری مانند جو دنیا میں ہوں دو چار غریب

ہے ادب جن کی شریعت میں تجارت کی مثال
مَیں نے اِس دور میں دیکھے ہیں کچھ ایسے بھی ادیب

جھوٹ کہہ سکتا ہوں ایمان ڈبو سکتا ہوں
پھر بھی لیڈر وہ نہ سمجھیں تو مرے اپنے نصیب

ساری تقدیر کی باتیں ہیں نہیں تو محمود
میں بھی ویسا ہی سپاہی ہوں کہ جیسا ہے نجیب[1]

[1] جنرل نجیب کے دورِ اقتدار میں لکھا گیا۔

○

قدیمی غلامو! مُبارک ہو شاہی
ہماری تو میراث ہے کج کلاہی

خدائی کے دعوے ہیں بندوں کو تیرے
کریں بندگی کس کی ہم یا الٰہی!

نہ جانے گناہوں کی پاداش کیا ہو
مرا جرم ہے جب مری بیگناہی

ستم دیکھئے لوٹتے تھے جو ہم کو
انھیں کے حوالے ہوئی داد خواہی

ترے بدلے نادم ہوں مَیں شیخ صاحب
یہ داڑھی یہ جبّہ یہ جھوٹی گواہی

یاسین خاںؒ

دیکھو یاسین خان کو دیکھو
اور پھر اس کی زبان کو دیکھو

ہیں حجامت میں آپ اپنی مثال
کھینچ لیتے ہیں پل میں بال کی کھال

انکے اوزار کیا کہوں تم سے
اُسترے ابتدائے آدم کے

قینچیاں دھات کے زمانے کی
اور مشینیں فقط دکھانے کی

شعر شاعر کی طرح پڑھتے ہیں
ہر گھڑی منہ سے پھول جھڑتے ہیں

حقہ جب گڑگڑا کے بولتے ہیں
ساری دنیا کے راز کھولتے ہیں

اک طرف یہ دکاندار بھی ہیں
دوسری سمت چوکیدار بھی ہیں

یاسین خان حجام دفتر مشرق کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ایک ٹانگ سے معذور تھے۔ مگر بڑے نکتہ رس اور سخن فہم تھے۔

اُنکے چاروں طرف کئے ہالہ
بیٹھا رہتا ہے سارا انبالہ

ان سے جو سر کبھی منڈاتا ہے
وہ سیاست بھی سیکھ جاتا ہے

میرے واقف نہیں ندیم بھی ہیں
صرف نائی نہیں حکیم بھی ہیں

جتنے فتنے ہیں سارے سو جائیں
جب یہ اک ٹانگ پر کھڑے ہو جائیں

○

کل ہم نے گزاری ہے کہاں رات نہ پوچھو

ہم خانہ بدوشوں کے مقامات نہ پوچھو

تم سن نہ سکو گے مَیں سنا بھی نہ سکوں گا

اب جانے بھی دو وجہِ شکایات نہ پوچھو

اِک پل میں شہنشاہ ہوں اک پل میں گدا ہوں

بہتر ہے کہ مجھ سے مری اوقات نہ پوچھو

مَے خانے کے دروازے تو ہر وقت کھلے ہیں

رندوں سے خرابات کے اوقات نہ پوچھو

جو صاحبِ ثروت ہو شریف اس کو سمجھ لو

اس صاحبِ ثروت کی مگر ذات نہ پوچھو

○

اب اپنی مملکت ہے اور اب اپنا اختیار
خود مالک مکان ہیں خود ہی کرایہ دار

ان کے دلوں کے حال کی تجھ کو خبر نہیں
معصومیت ہے جن کی نگاہوں سے آشکار

سنتا ہوں خاص طور پہ اکثر سفید پوش
ہوتے ہیں عام طور پہ اکثر سیاہ کار

ثابت نہ کر سکے وہ مرا جرم تو کہا
یہ آدھا کمیونسٹ ہے اور آدھا خاکسار

محمودؔ کوئی اور جو کہتا تو بات تھی
اب مے فروش بھی ہمیں کہتے ہیں بادہ خوار

فرمودۂ اقبالؒ

ہے پیار اُن جوانوں سے اقبالؔ کو
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یہ سچ ہے مگر وہ جواں اب کہاں
عزائم تھے جن کے یہاں تک بلند

جو ہیں بھی تو بالفرض یہ جانیئے
ہیں شیروں کے ملبوس میں گوسفند

سبق بھولتے گر نہ اجداد کا
زبوں حال ہوتے نہ یوں دردمند

یہ حالت ہے ان کی بقولِ کسے
نشستند و گفتند و برخاستند

○

کچھ ایسے بدلے کہ تہذیب بھی بدل ڈالی
وہ بات کرتے ہیں ہم سے گورنروں کی طرح

نقاب پر ہی تھا موقوف ورنہ صورت تو
ستمگروں کی طرح ہے نہ دلبروں کی طرح

بعید کیا ہے وہ دِل لے کے پھر مکر جائیں
نظر جو آتے ہیں اس وقت ممبروں کی طرح

خبر بھی ہے تجھے ہندوستاں کہ کون ہیں یہ
جو آج بستے ہیں تجھ میں قلندروں کی طرح

اکیلے تم ہی تو محمودؔ بت پرست نہیں
ہزاروں ایسے مسلماں ہیں کافروں کی طرح

○

وہ ہم سے کہتے ہیں اب مئے پرستیاں نہ کرو
سنا ہے چلتے ہیں محفل میں جن کی جام پہ جام

سوال یہ ہے کہ رشوت ہے جرم تو کیونکر
کسی کے حق میں حلال اور کسی کے حق میں حرام

نہ مجھ سے پوچھئے سرکار کیا غرض ہے مری
میں چاہتا ہوں وہی کچھ جو چاہتے ہیں عوام

خبر نہیں ہے کہ انجام اس کا کیا ہوگا
نہ تیرے حسن کی قیمت نہ میری جیب میں دام

ہمارے واسطے انعامِ شاعری ہے یہی
کسی حسیں کا تبسم کسی حسیں کا سلام

مردم شماری

حکم آیا ہے ہمیں مردم شماری کیجیے
سن کے یہ آخر جلائیں کیوں نہ ہم گھی کے چراغ
ہاں مگر یہ عورتوں کے نام کیوں کر پوچھیے
دو دفعہ اس سلسلے میں پٹتے پٹتے بچ گئے

ہے محلے دار کے ہاتھوں میں سارا انتظام
حاضری دیتے ہیں اس کے در پہ جا کر صبح و شام
بادلِ ناخواستہ نمٹا ہی دیتا ہے وہ کام
کیونکہ اس کے دل میں ہے پولیس کا بھی احترام

کس گلی میں کس کا ہے گھر بار ہم سے پوچھیے
وہ بھلا چنگا ہے یا بیمار ہم سے پوچھیے
کام پر ہے یا کہ ہے بے کار ہم سے پوچھیے
وہ مہاجر ہے کہ ہے انصار ہم سے پوچھیے

کیا بتائیں ہم کہ یہ کتنا مبارک کام ہے
شام اس کی صبح ہے اور صبح اس کی شام ہے
یہ بھی دیکھا ہے کہ بیٹا باپ کا ہمنام ہے
بارہا سوچا ہے یہ کیسا گردشِ ایام ہے

بعض گھر ایسے بھی تھے لڑکے ہی لڑکے تھے جہاں
بعض گھر ایسے تھے جن میں لڑکیاں ہی لڑکیاں
بعض گھر ایسے تھے جن میں صرف بیوی اور میاں
لطف یہ ہے تھا نہ چاروں کا کہیں نام و نشاں

بعض یہ سمجھے کہ ہم ٹیکے لگانے آئے ہیں
بعض یہ سمجھے کہ ہم ان کے نئے ہمسائے ہیں
بعض یہ سمجھے کہ ہم اللہ میاں کی گائے ہیں
کیا کہیں اس سلسلہ میں نام کیا کیا پائے ہیں

ہم کو لکھنے سے غرض تھی لامکاں تک لکھ گئے
لکھتے لکھتے بعض بے نام و نشاں تک لکھ گئے
ساتھ انسانوں کے اکثر بے زباں تک لکھ گئے
نام ہی تو تھے خدا جانے کہاں تک لکھ گئے

○

کوئی جانے تو ان کو پہچانے
کتنے ہشیار ہیں یہ دیوانے

میری رودادِ غم سنو تو سہی
بھول جائیں گے سارے افسانے

پرمٹوں کے سوا نہیں بنتے
جھونپڑوں کی بجائے کاشانے

منتقل ہو رہے ہیں سنتا ہوں
ہوٹلوں میں کئی صنم خانے

تجھکو محمودؔ کیا بتوں سے غرض
تو نے توڑے ہوئے ہیں بت خانے

○

دیکھو مجھے دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھو
اتنا نہیں بدنام کہ جتنا ہوں میں مشہور

حالات پہ موقوف ہے دُنیا میں بہت کچھ
دیکھا ہے کہ خوددار بھی ہو جاتے ہیں مجبور

ہم ڈپٹی کے بھائی کو سمجھتے نہیں ڈپٹی
اس واسطے معتوب ہیں اس واسطے مقہور

اب کس طرح مانیں کہ بدلتا ہے زمانہ
ہم پہلے بھی مزدور تھے اور اب بھی ہیں مزدور

الیکشن

اس الیکشن میں ہم نے کیا دیکھا اک انوکھا سا ماجرا دیکھا
کچھ سمجھ میں نہ آسکا محمودؔ جیتنے والا ہارتا دیکھا

گننے والے کو اس پہ حیرت ہے کس طرح یہ مرے یہاں نکلیں
چار سو ووٹروں کی تھی فہرست سات سو بیس پرچیاں نکلیں

اپنے ممبر کی کامیابی کو بعض لوگوں نے نام بدلے تھے
بیویوں نے بھی جوش میں آکر شوہرانِ کرام بدلے تھے

کچھ بزرگوں نے ساتھ ہی اپنے نونہالوں کے ووٹ دے ڈالے
بعض جدت پسند لوگوں نے مرنے والوں کے ووٹ دے ڈالے

تجربہ تھا جنھیں الیکشن کا اور جنھوں نے مزے اُڑائے تھے
کامیابی کے واسطے ووٹر دوسرے شہر سے بھی لائے تھے

نوٹ لے کر جو ووٹ دیتے تھے ان فقیروں کو ہم نے دیکھا ہے
ہم نے دیکھا ہے جنس کی صورت
آدمی کس طرح سے بکتا ہے

○

نمایاں ہو گی کیا اتنی کسی اخبار کی سرخی
دکھاؤں آ تجھے اپنے رخِ دلدار کی سرخی

اگرچہ جانتا ہوں میں کہ یہ اصلی نہیں پھر بھی
قیامت ڈھا رہی ہے آپ کے رخسار کی سرخی

سرِ محفل تو ہم کہہ دینگے ہم نے خودکشی کر لی
چھپے گی کس طرح لیکن تری تلوار کی سرخی

نظر آئے گی مزدوروں کے خوں کی اس میں آمیزش
اگر تو غور سے دیکھے رخِ زردار کی سرخی

○

سفینہ ڈوب رہا ہے تو کوئی بات نہیں
یہی تمھاری رضا ہے تو کوئی بات نہیں

گماں نہ تھا کہ محبت میں ٹیکس بھی ہوگا
اگر یہ جرم وفا ہے تو کوئی بات نہیں

مرا خلوص وہی اب بھی ہے جو پہلے تھا
ترا سلوک جدا ہے تو کوئی بات نہیں

جو تجھکو جانتے ہیں یوں بھی جان لیتے ہیں
نقاب اوڑھ لیا ہے تو کوئی بات نہیں

مجھے تمھاری خوشی کا خیال رہتا ہے
زمانہ مجھ سے خفا ہے تو کوئی بات نہیں

تمھارے نام پہ دنیا نے مجھ کو لوٹا ہے
جو تم نے لوٹ لیا ہے تو کوئی بات نہیں

○

تڑپتے تڑپتے گذاریں گے راتیں، یہ ظاہر ہے جو دل سے مجبور ہونگے
ضرورت اگر آپڑی کوئی ایسی تو دیکھو گے سینوں میں ناسور ہونگے

خبر ہی نہیں تجھکو تعزیر میں ہمکو محسوس ہوتی ہے لذت کہاں تک
تغافل پہ ہم تیرے ممنون ہونگے، ستم آزمائے تو مشکور ہوں گے

غلط ہی سہی ضابطہ تو ہے کوئی نظام جہاں پر تعجب ہے تجھکو
سنا ہے یہ ہم نے وہ دن آرہے ہیں نہ آئین ہوگا نہ دستور ہونگے

الٰہی یہ زردار مخلوق تیری عجب کیا ہے جنت بھی ٹھیکے پہ لے لے
یہ ثابت ہوا جو یہاں پر ہیں مزدور وہ حشر تک یونہی مزدور ہونگے

سنا ہے کہ بل پاس ہونگے کچھ ایسے، بدل جائیگی بے نواوں کی دنیا
مگر اب ذرا اتنی مشکل ہے باقی کہ جب پیش ہونگے تو منظور ہونگے

اگر بچ کے کشمیر سے آگئے تو جھناکوں کی جھنکار سنتے رہینگے
نہیں تو سمجھ لینا یہ اپنے دل میں کہ ہم لوگ مرحوم و مغفور ہونگے

ہسپتال

یہ ہسپتال کہ کہتے ہیں جس کو خیراتی
بڑا عجیب ادارہ ہے اہلِ زر کے لیئے
یہاں انھیں کوئی تکلیف ہو نہیں سکتی
ہر اک طرح کا سکوں ہے دل و نظر کیلیئے

رہے غریب تو ان کو سکوں سے کیا مطلب
وہ ہر طرح سے گزر اپنی کرتے رہتے ہیں
وہ کس مپرسی کے جیتے یہ کیوں نہ صبر کریں
کہ کس مپرسی کے عالم میں مرتے رہتے ہیں

وہ ڈاکٹر کہ جو تنخواہ دار ہیں پھر بھی
بطور شکریہ ہر اک سے فیس لیتے ہیں
جو فیس دے نہیں سکتے وہ مفلسوں میں مدام
بڑے خلوص سے ان کو دعائیں دیتے ہیں

اس ہسپتال پہ جنت کا بھی گماں ہے مجھے
کہ کالے رنگ کی حوریں بھی اس میں دکھی ہیں
اگرچہ ہیں وہ اِسی دیس کی مگر اکثر
ہر اک سے مغربی لہجے میں بات کرتی ہیں

جو دودھ بانٹتے ہیں ان کی کیفیت ہے جدا
کہ نصف بیچتے ہیں اور نصف پیتے ہیں
رہے مریض تو اب ان کا حال مت پوچھو
کہ وہ غریب تو بس آس پہ ہی جیتے ہیں

یہ میل نرس یہ جاروب کش یہ چوکیدار
بلائے جاں ہیں مریضانِ ناتواں کیلئے
روش کو دیکھ کے ان کی یہ کہنا پڑتا ہے
بہانہ چاہیئے اک مرگِ ناگہاں کیلئے

برآمدوں میں یونہی تا بہ کے مریں گے عوام
میں سوچتا تھا کہ انجام اس کا کیا ہوگا
کہا یہ سن کے مرے ایک دوست نے مجھے
"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا"

○

تیری محفل تری محفل ہے مگر
ہم چلے جائیں تو کیا رہتا ہے

آج کل پھر ذرا گردش میں ہیں ہم
آج کل پھر وہ خفا رہتا ہے

مصلحت ہے یہ خموشی ورنہ
دِل میں اک حشر بپا رہتا ہے

اُس نے اِکدن بھی نہ پوچھا ہم سے
کیوں گریبان کھلا رہتا ہے

○

محکوم تو خود دار کبھی ہو نہیں سکتا
ہنسنا تو بڑی چیز ہے وہ رو نہیں سکتا

آزادوں کی تقلید تو کرتا ہوں بہت کچھ
اس داغِ غلامی کو مگر دھو نہیں سکتا

مفلس کے مقدّر میں جو ہے گریۂ پیہم
منعم کو شکایت ہے کہ وہ سو نہیں سکتا

چند مزاح نگار

باتیں ہیں یہ تحقیق کی یہ مسئلے ہیں غور کے
کہہ دو کہ شوکت[1] تھانوی انشا[2] ہیں اپنے دور کے

یہ ہیں عظیم[3] خوش بیاں یعنی یہ مشتِ استخواں
ہیں یہ بھی اپنے وقت کے شیریں سخن معجز بیاں

پڑھنے کا بھی اک ڈھنگ ہے کہنے کا بھی اِک طور ہے
یعنی ضمیر[4] خوشنوا کی بات ہی کچھ اور ہے

اپنے نذیر احمد[5] بھی ہیں اک شیر اس میدان کے
صورت سے یوں لگتا ہے یہ جرنیل ہوں جاپان کے

---

[1] شوکت تھانوی [2] انشاء اللہ خان انشاؔ [3] پروفیسر عظیم الکریم [4] میجر ضمیر جعفری [5] شیخ نذیر احمد۔

یہ ہیں ظریفؔ[1] نکتہ داں یعنی یہ نقّادِ زماں
ہیں ختم جن کی ذات پر الفاظ کی باریکیاں
پھر بھی ہم اپنے رنگ کے اک صاحبِ ایجاد ہیں
لیکن محمدؔ[2] جعفری ہر حال میں استاد ہیں

---

[1] ظریف جبل پوری [2] سید محمد جعفری۔

○

پورب کے ساکنوں کے طریقِ عمل پہ چل
اِس دور میں کسی کی نصیحت نہ کر قبول

ووٹر ہو سارا شہر تو ممبر نہ بن کبھی
گھر کو لٹا کے مفت کی ذلّت نہ کر قبول

حق بات کہہ کے دار پہ چڑھنا پڑے تو چڑھ
لیکن ذلیل بن کے فضیلت نہ کر قبول

گر چاہتا نہیں کہ کرے مفت خدمتیں
ہرگز کسی امید کی دعوت نہ کر قبول

یہ بیچنے کی چیز نہیں لے خبر نہ بیچ
اس حسنِ بے پناہ کی قیمت نہ کر قبول

○

کوئی موٹر کی ہوا کھاتا ہے کوئی اس کی گرد
دیکھتا جا اس کو کہتے ہیں جہاں کے گرم و سرد

جنگ سر پر ہے ادھر اور سوچتا ہوں میں ادھر
کس قدر ہیں عورتیں اور کس قدر ہیں ہم میں مرد

پڑھ مرے اجداد کی تاریخ گر باور نہ ہو
قوم کی قسمت بدل سکتا ہے کیونکر ایک فرد

پھر ہمیں صحرا نوردی کے دیئے جاتے ہیں طعن
پھر دکھاتا ہے ہمیں کیا چیز تھے صحرا نورد

گر تجھے پاس اخوت ہو تو اسے سرمایہ دار
تیرے جوتوں پر چمک ہو اور مرے چہرے پہ گرد

قائدِ اعظم

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے — تو نے پاکستان بخشا ہے ہمیں

سیم و زر کی کان بخشی ہے ہمیں — نعمتوں کا خوان بخشا ہے ہمیں

دیکھ کر جس کو زمانہ دنگ ہے — وہ سر و سامان بخشا ہے ہمیں

یعنی جو کچھ تھا ترے مقدور میں — تا حدِ امکان بخشا ہے ہمیں

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے

اِک عجب نقشہ تھا اپنا اِس گھڑی — سب کے سب اپنی جگہ حیران تھے

وارثوں کی تھی نہ جس کے انتہا — ایک ایسے گھر کے ہم دربان تھے

جس طرف جانے کا رخ کرتے تھے ہم — اس طرف طوفان ہی طوفان تھے

ایسی حالت میں بھی تھا تو مطمئن — ایک تیرے ہی بجا اوسان تھے

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے

میز اگر موجود تھی کرسی نہ تھی — تھی اگر کرسی تو پھر منشی نہ تھا

تھا اگر منشی تو ایسے حال میں — کام پہ لگتا ہی اس کا جی نہ تھا
جی اگر لگتا تو آخر کس طرح — جب کہ اس کے پاس کاغذ ہی نہ تھا
ایسی صورت میں تسلّی کیلئے — ایک تو تھا اور کوئی بھی نہ تھا

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے

تاب لکھنے کی نہیں ہے کیا لکھیں — کیا کہیں ہم پر ستم کیسے نہ تھے
ریل کے انجن تھے اور ریلیں نہ تھیں — بنک تھے ان میں مگر پیسے نہ تھے
دیکھتے تھے چار سو حسرت سے ہم — بولتے گو منہ سے ہم ویسے نہ تھے
تجھ کو بھی احساس تھا ہر بات کا — پر ترے انداز ہم ایسے نہ تھے

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے

رہ سکیں گے ہم نہ قائم اس طرح — یہ بھی اک افواہ سی مشہور تھی
تیری ہمّت تیرا استقلال تھا — ورنہ تیری قوم تو مجبور تھی
غور تھا غیروں کی ہر اک بات پر — اپنی ہر درخواست نامنظور تھی
سوچتے تھے جانے کیا انجام ہو — ہم یہاں تھے فوج سنگاپور تھی

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے

بچ گئے ہم سخت جانی کے سبب — حادثہ گرچہ بڑا جانکاہ تھا

اپنوں کا خنجر ہے گردن پر رواں — اب کریں کس منہ سے غیروں کا گلہ

لُٹ رہے ہیں ہم تمہارے نام پر — کون ہے جس سے کہیں یہ ماجرا

کیا بتائیں کوئی کل سیدھی نہیں — اب خدا حافظ ہے پاکستان کا

قائدِ اعظم خدا بخشے تجھے

○

تو نے صیّاد اگر بھیڑ سے بگاڑا ہے تو کیا
بارہا پہلے بھی بگڑا ہے نشیمن بنکر

زر کو ترجیح نہ دے دل پہ کہ یہ عارضی ہے
سینکڑوں بگڑے ہیں دنیا میں مہاجن بن کر

ہائے ان لوگوں کی تقلید کا سودا ہے ہمیں
آئے دن جن کے بگڑ جاتے ہیں فیشن بن کر

دشمنی دوستی کے پردے میں ہوسکتی ہے
دشمنی کر نہیں سکتا کوئی دشمن بن کر

عربی کوئی نہیں بولتا حج سے آکر
جو بھی لندن سے پلٹتا ہے تو کرزن بنکر

ہائے کس روز بنا ہوگا وہ کپڑا محمودؔ
دھجیاں اڑتی ہیں جس کی میرا دامن بن کر

○

نرخ ہر شے کا گراں ہے یارو
جب سے ماہِ رمضاں ہے یارو

ڈالڈے پر ہی قناعت کر لیں
لیکن اب وہ بھی کہاں ہے یارو

مجھ کو میری ہی سناتے ہیں غزل
کیا عجب زورِ بیاں ہے یارو

کس قیامت کا گلا پایا ہے
یہ مرے بچوں کی ماں ہے یارو

○

جو نہیں جانتے مجھ کو انھیں کہہ دو یہ فقیر
ساری دنیا کے خزانوں پہ بھی بیچے نہ ضمیر

اب مجھے کاکلِ مشکیں کے فسانے نہ سنا
اب نہ زلفیں ہی رہی ہیں نہ وہ زلفوں کے اسیر

ہاتھ ہر روز دکھاتے ہیں جو رمّالوں کو
یہ مِرے شہر میں ہوتے تھے کسی وقت وزیر

نامہ بر اب نہ وہاں جا کہ یہاں میرے لئے
آج کل سب سے بڑا مسئلہ ہے نانِ شعیر

جن کے اجداد کا دریوزہ گری پیشہ تھا
مَیں نے اس دور میں دیکھے ہیں کچھ ایسے بھی امیر

انتخابات

انتخابات ہونے والے ہیں
انقلابات ہونے والے ہیں

جیسے حالات تھے کبھی پہلے
ویسے حالات ہونیوالے ہیں

بھائی بھائی میں باپ بیٹے میں
اختلافات ہونے والے ہیں

زور دستوں کے زیر دستوں سے
ایک دو ہات ہونے والے ہیں

بر سرِ عام راز کھلنے ہیں
انکشافات ہونے والے ہیں

جلسہ گاہوں میں ماہ پاروں سے
اتفاقات ہونے والے ہیں

پھر مچلتا ہے دل کہ سچ کہہ دیں
پھر حوالات ہونے والے ہیں

مارشل لاء

مارشل لاء میں کیا کیا دیکھا — ایک عجیب تماشا دیکھا

سڑکوں کے سنہراؤ دیکھے — چونے کا چھڑکاؤ دیکھا

ڈھب پر پایا ہر بے ڈھب کو — ناک کی سیدھ پہ دیکھا سب کو

مجرم دیکھے لاری دیکھی — منّت دیکھی زاری دیکھی

پگڑیاں دیکھیں طرّے دیکھے — جرمانے اور درّے دیکھے

ہر اک چیز کا ریٹ لکھا ہے — گاہک بے خطرے لیتا ہے

رومی دیکھے، رازی دیکھے — اکثر چور نمازی دیکھے

آگے گھوڑی بھٹکی دیکھی — پیچھے بوری لٹکی دیکھی

ارزاں سودا لینے دیکھا — سیٹھ بھی جھاڑو دیتے دیکھا

خوشحالی ہی خوشحالی ہے ‏ ‏ شہر فقیروں سے خالی ہے
یوں بکتے ہیں رنگ کے ڈبّے ‏ ‏ جیسے چٹنی اور مربّے
اب ہلے صاف پتیلے دیکھے ‏ ‏ چمچے تک چمکیلے دیکھے

اچّھی اچّھی سب لکھ لی ہیں
اور کچھ باتیں چھوڑ بھی دی ہیں

○

اسمبلی یہ نہیں ہے شراب خانہ ہے
یہاں کسی کو کسی سے بھی اختلاف نہیں

یہ آپ کس لئے تجدیدِ عہد کرتے ہیں
ہمارے واسطے یہ کوئی انکشاف نہیں

قبول ہوتی ہیں اکثر دعائیں بنگلوں میں
یہ کیا کریں کہ ہمیں عادت طواف نہیں

ہمارا قائد اعظم کے ساتھ فوٹو ہے
انہیں ہماری سیاست کا اعتراف نہیں

آزادی

دوستو اب عیش فرماؤ کہ تم آزاد ہو
جس طرف چاہو چلے جاؤ کہ تم آزاد ہو

تندرستی سی کوئی نعمت زمانے میں نہیں
گھی سمجھ کر ڈالڈا کھاؤ کہ تم آزاد ہو

بے حجابی بھی ہے اب فیشن پرستی میں شمار
سب کو بے پردہ نظر آؤ کہ تم آزاد ہو

عائلی قانون حاوی ان پہ ہو سکتا نہیں
مولوی صاحب کو سمجھاؤ کہ تم آزاد ہو

دندناؤ کوچہ و بازار میں شام و سحر
اور گدائی پیشہ فرماؤ کہ تم آزاد ہو

نوچ لو چہروں سے تم پردہ نشینوں کے نقاب

اپنے ماضی سے نہ شرماؤ کہ تم آزاد ہو

ہو سکے تو سود کھاؤ اور سمگلنگ بھی کرو

بعد ازاں حج کو چلے جاؤ کہ تم آزاد ہو

چور بازاروں کو پکڑو اور پھر ان کو بخش دو

یعنی ان سے رشوتیں کھاؤ کہ تم آزاد ہو

ملک کے کپڑے پہن کر لیڈری کے روپ میں

سادہ دل لوگوں کو بہکاؤ کہ تم آزاد ہو

پہلا مصرع اتفاقاً بحر میں پڑھنے کے بعد

دوسرا بے بحر پڑھ جاؤ کہ تم آزاد ہو

○

ہاتھ آتے نہیں ہیں وہ جب تک
پاکبازی ہی پاکبازی ہے

بات مطلب کی ہے خلوص کہاں
ہر طرف اب زمانہ سازی ہے

خبر اپنی نظر نہیں آتی
جب یہی شانِ دلنوازی ہے

لوٹ کر عاشقوں کو فرمایا
مال موذی ہے شکم غازی ہے

تجھ کو رندوں کی کیا خبر زاہد
یہ ولی ہیں جو تو نمازی ہے

○

کرفیو کرفیو کہہ کر نہ ڈراؤ ہم کو
ہم سے پابندیٔ اوقات بہت مشکل ہے

ایک دن کا ہو تماشا تو کوئی بات بھی ہے
روز سوغات یہ سوغات بہت مشکل ہے

جن کو آتے ہوں غلامی میں حضوری میں مزے
ترک کر دیں گے خطابات بہت مشکل ہے

تیرے تقویٰ پہ ہمیں شک نہیں زاہد پھر بھی
اس زمانے میں کرامات بہت مشکل ہے

ہوش میخانے کے دروازے پہ آتا ہو جنہیں
چھوڑ دینگے وہ خرابات بہت مشکل ہے

○

وہ جو پوچھیں تو کیا کہوں ان سے
پھر رہا ہوں اداس اداس کہاں

اب کفن کے لئے بھی پرمٹ ہے
اب وہ آرائشِ جمال کہاں

جانتے ہو کہ چینی مہنگی ہے
میری باتوں میں اب مٹھاس کہاں

اتنا وسواس بھی نہیں اچھا
میری بیوی نہیں تو ساس کہاں

مے کدے بند ہو گئے محمود
اب صراحی کہاں گلاس کہاں

شہرت

کہا سیّد سے یہ جا کر کسی نے
کہ ناواقف ہے مجھ سے اِک زمانہ

کوئی ترکیب ہو تو خیر — ورنہ
نہ چھوڑوں گا کبھی یہ آستانہ

کہا سیّد نے شہرت چاہیئے تو
بنا کر بھیس اپنا عالمانہ

ہماری شان میں گستاخیاں کر
تجھے پہچان جائے گا زمانہ

○

پکارنے کا قرینہ مَیں سوچتا ہی رہا
حسیں کہوں کہ حسینہ مَیں سوچتا ہی رہا

مَیں سوچتا ہی رہا کس طرف کو ساحل ہے
کدھر چلا ہے سفینہ میں سوچتا ہی رہا

نمی سی تھی دمِ رخصت کچھ اس کے آنچل پر
وہ اشک تھے کہ پسینہ مَیں سوچتا ہی رہا

ترے کرم کی کوئی حد نہیں حساب نہیں
پچبا کے نان شبینہ مَیں سوچتا ہی رہا

ادھر وہ آئے تھے پہلی کو ایک پل کیلئے
ادھر تمام مہینہ مَیں سوچتا ہی رہا

چوک یادگار

دیکھنا چوک یادگار ہے یہ
اور ہمیں اس کا احترام بھی ہے

اس کو نسبت ہے خاص لوگوں سے
یہ زیارت گہِ عوام بھی ہے

صبح اس کی ہے گر بنارس کی
شام اس کی اودھ کی شام بھی ہے

اس کو سیاح آ کے دیکھتے ہیں
اس کا تاریخ میں مقام بھی ہے

ساری تقریریں اس پہ ہوتی ہیں
یعنی اک جلسہ گاہ عام بھی ہے

سامنے اس کے ایک جانب کو
کوڑے کرکٹ کا اک مقام بھی ہے

○

بات پر جب اُن کی محفل میں زباں کٹنے لگی
رفتہ رفتہ ہم کو خاموشی کی عادت ہو گئی

ہم ادھر ظلم و ستم سہنے کے خوگر ہو گئے
اس طرف ان کو ستم کوشی کی عادت ہو گئی

چل گیا ہم پر بھی ان آنکھوں کا جادو چل گیا
ہو گئی ہم کو بھی مے نوشی کی عادت ہو گئی

تیری زلفوں کی مہک سے ہوش میں آ بیٹھے گیا
جن بلا نوشوں کو مدہوشی کی عادت ہو گئی

اور بھی کچھ نکھرے نکھرے سے نظر آنے لگے
جب سے ان کو خود فراموشی کی عادت ہو گئی
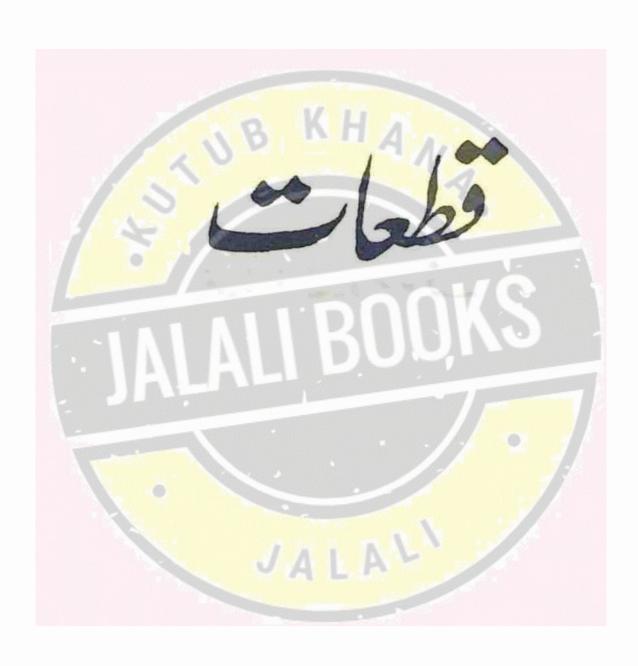
اقتصادی مسئلہ ہے یہ نہ ہم سے پوچھیے
کیا کہیں کیوں ہم کو خوش پوشی کی عادت ہو گئی

KUTUB KHANA
قطعات
JALALI BOOKS
JALALI

از شعلہ تراشیدہ ام حرف

جو بھی ملتا ہے مجھ سے کہتا ہے
تازہ قطعات سننا چاہتا ہوں
ایسا کوئی نہیں ہے جو یہ کہے
تیرے حالات سننا چاہتا ہوں
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

خودی

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں دیکھیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

طائرِ لاہوتی

آج ان کی حقیقت کو افسانہ سمجھتے ہیں
کل جن کی فقیری میں مضمر تھی شہنشاہی
اس دور میں ایسے بھی ہیں طائرِ لاہوتی
آتی ہی نہیں جن کی پرواز میں کوتاہی

مِن فضلِ ربّی

حقیقت کی تجھ کو خبر ہی نہیں ہے
نہ جا ان کے ظاہر پہ میرے مربّی
کمائی پہ رشوت کی اکثر بنے ہیں
وہ گھر جن پہ لکھا ہے "مِن فضلِ ربّی"

رشوت

مَیں ماتحت تھا آپ افسر تھے
سچّی بات اب کون کہے
میرے ہاں تو مینہ برستا تھا
آپ کے ہاں پرنالے بہے

ڈپٹی کمشنر

ہماری عید ہے ہم ہر طرح منائیں گے
ہمارا شیخ کے فتوے پہ اعتبار نہیں
ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے
ہمیں یقیں ہے کہ وہ غیر ذمّہ دار نہیں

عافیت

آج اسی میں ہے عافیت ورنہ
آنکھ رکھتے ہیں کان رکھتے ہیں
جیل خانہ ہے ان کا صدر مقام
جو بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

عید کا چاند

عید رک جائے گی ایسا کوئی امکان نہیں
وسوسہ اب یہ مرے دل میں کدھر آتا ہے
میرا اس مفتیٔ دیں پر ہے عقیدہ جس کو
رات کے بارہ بجے چاند نظر آتا ہے

تاریخ

خط میں لکھا ہے عید کس دن ہے
ہم کو تاریخ لکھ کے بھجوائیں
چونکہ جھگڑا تھا اس لئے ہم نے
لکھ دیا آپ جب بھی آجائیں

کشمیر

ظُلم کشمیر میں ہوا ہے بہت
سوچتے ہیں کہ کیا علاج کریں
آؤ سب مل کے بد دعائیں دیں
آؤ سب مل کے احتجاج کریں

ثالث

اہلِ مغرب کی سیاست پہ بھروسہ ہے ہمیں
دیکھیں کیا فیصلہ کشمیر کا فرماتے ہیں
گرمیاں آئیں تو آجاتے ہیں ثالث بن کر
سردیاں آئیں تو یورپ کو چلے جاتے ہیں

آٹا

تمھارا کام ہے یہ اس لئے تم جانتے ہوگے
ہماری تو سمجھ میں یوں بھی کچھ تھوڑا سا گھاٹا ہے
خداوندانِ آشن تم ہی اب ہمکو یہ سمجھاؤ
کہ جو شے کھاتے ہیں ہم وہ بھوسا ہے کہ آٹا ہے

مسئلہ

ناقص آٹے پہ احتجاج نہ کر
یہ تو تقدیر کا معاملہ ہے
غیر ممکن ہے اس کا حل محمود
یہ بھی کشمیر کا معاملہ ہے

وزارت

تیری دانست میں وزارت ہے
میری دانست میں یہ دھندا ہے
سب کی گردن میں ٹھیک آتا ہے
یہ اک ایسا عجیب پھندا ہے

سابق وزیر

کہہ رہے تھے ایک جلسے میں کوئی سابق وزیر
کوٹھیاں تک ہم نے بنوائی تھیں اپنے واسطے
باوجود اس کے بھی سنتا ہوں کہ کچھ کج فہم لوگ
کہتے پھرتے ہیں ہمارے کام تعمیری نہ تھے

تخفیف

جو کہانی کہ تھی تخیّل میں
اب وہ تصنیف ہونے والی ہے
اک وزیر اور بڑھنے والا ہے
اور تخفیف ہونے والی ہے

ستم ظریفی

تیرا ارشاد بجا ہے مرے محبوب مگر
آج کل چاہنے والا ترا تکلیف میں ہے
مَیں نے تنخواہ کی قلّت کی شکایت کی تھی
ہنس کے فرمایا اسامی تری تخفیف میں ہے

در مدحِ خود

جب سے بدلا ہے وہ نظامِ کہن
بے نوا بے سہارے اچھّے ہیں
میرے حالات کے سوا محمودؔ
باقی حالات سارے اچھّے ہیں

شادی

یہ کام جو مشکل نہیں آساں بھی نہیں ہے
آسان اگر ہوتا تو میَں کر نہ گزرتا
بہتر ہے کہ شادی کیلئے مجھ سے نہ کہئے
میَں اور کلرکوں میں اضافہ نہیں کرتا

پردہ

سنا ہے اپنے عزیزوں سے پردہ کرتے ہیں
جو غیر ہو تو کوئی شرم ہے نہ پردا ہے
سوال یہ ہے کہ اب ان سے کس طرح پوچھوں
یہ ہم کو آپ نے کب سے عزیز سمجھا ہے

شکایت

حوّا کی کسی بیٹی کا کہنا ہے کہ لڑکے
اکثر سرِ رہ گھورتے ہیں دیکھ کے مجھکو
کہہ دو اسے اک ہاتھ سے بجتی نہیں تالی
تو خود جو نہ دیکھے تو شکایت نہ ہو تجھ کو

ٹیکس یا چندہ

سن کے میرا مدّعا سرمایہ دار
دیر سے کھاتوں میں اپنے غرق ہے
سوچتا ہوں کیسے سمجھاؤں اسے
ٹیکس اور چندے میں کتنا فرق ہے

خوشامد

کھرے، وعدے کیے پکّے، صاحب دل
کہا میں نے اکیلے آپ ہی ہیں
ہنسے اور ہنس کے فرمایا کہ سچ ہے
خوشامد کے طریقے اور بھی ہیں

تھانیدار

ایک دہقاں یہ کر رہا تھا دعا
حق میں اک مہرباں کمشنر کے
تو نے عزّت مری بچائی ہے
جا خدا تجھ کو تھانیدار کرے!

مہاجر

اصلی مہاجرین، سیاسی مہاجرین!
اور ان کے ماسوا ہیں مقامی مہاجرین
اب سوچنا یہ ہے کہ انھیں کیا الاٹ ہو
بدقسمتی سے ہیں جو مقامی مہاجرین

بشیر ساربان

ہے کراچی میں اک بشیر جسے
لعل کہتے ہیں ہیرا کہتے ہیں
اور اک میرا یار بھی ہے بشیر
لوگ جس کو بشیرا کہتے ہیں

ہسپتال

کیا بتائیں آپ کو کیا ہے ہمارا ہسپتال
انتظام ایسا کہ بس دل کی کلی کھل جائے ہے
حادثاتِ اتفاقی کا بھی ہے اک ڈاکٹر
اتفاقی طور پہ مل جائے تو مل جائے ہے

پردہ نشیں

مرد بھی ہوتے ہیں مشاعروں میں
کچھ خبر بھی ہے تجھ کو پردہ نشیں
ہنس کے فرمایا آج کل محمودؔ
ہم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں

ساڑھی

ہم بھی زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گئے
اے دخترِ وطن تیری ساڑھی کو دیکھ کر
پہلے بھی ایک بار یہ گزرا تھا حادثہ
عبدالوہاب[1] خان کی داڑھی کو دیکھ کر

---

[1] مولوی عبدالوہاب خان سابق سپیکر مرکزی اسمبلی۔

لیڈر

ہم کو کشمیر فتح کرنا ہے
یعنی پھر امتحان دینا ہے
آپ لیڈر ہیں آپ کا کیا ہے
آپ کو تو بیان دینا ہے

سابق سیاستدان

ہم نے کل اک قبر دیکھی جس پہ تھا لکھا ہوا
سونے والا اس میں اک سابق سیاستدان تھا
جب سنی یہ بات اک لیڈر نے تو ہنس کر کہا
قبر پختہ ہے تو مردہ "صاحبِ ایمان تھا"

داشتہ آید بکار

ممکن ہے کہ پڑ جائے کبھی اس کی ضرورت
ہر ایک کو مے خانے میں یہ راز بتا دو
جس شخص کو مے پی کے بھی ہوتا نہ ہو نشہ
اس شخص کو مظہرؔ کی غزل پڑھ کے سنا دو

غلط فہمی

یہ ہے شاعر عجیب انساں ہے
اس کی قدرت کے کارخانے میں
کان میں اس کے کہہ گیا کوئی
تجھ سا کوئی نہیں زمانے میں

ے سید مظہر گیلانی

مقلّدین

سکندر[1] مرزا صاحب کے بارے میں یہ سُنتا ہوں
کہ وُہ ہمراہ بیگم کے سمندر پار بیٹھے ہیں
اِدھر ان کے وزیروں کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے
بہُت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

تشہیر

آنے والے تجھے خدا کی قسم
جانے والے کی دیکھ لے تشہیر
لوگ اس کو بھی پوجتے تھے کبھی
وہ بھی تیری طرح کبھی تھا وزیر

[1] سابق گورنر جنرل پاکستان۔

تنخواہ

میری تنخواہ سَو ہے اور ان کے
آٹھ سَو کے قریب ہوتے ہیں
جب مہینہ تمام ہوتا ہے
مَیں بھی روتا ہوں وہ بھی روتے ہیں

عہدِ رفتہ

اب مجھ سے عہدِ رفتہ کی سرمستیاں نہ پوچھ
اے میرے دوست اب تو وہ قصّے ہیں خواب کے
تفصیل کیا بتاؤں تجھے مختصر یہ ہے
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

مرگِ مفاجات

کرگس کے کسی طور بدلتے نہیں حالات
غیروں کے بھروسے پہ کہاں تک گزرِ اوقات
جیتا ہے تو شاہیں کی طرح جی کہ جہاں میں
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

سفارش

کروں کیا تیری سفارش نہ سنیں گے شیخ صاحب
مرے دوست تو نے ناحق مجھے زحمتِ سفر دی
کئی سال ہو گئے ہیں وہ خفا ہیں مجھ سے اس پر
کہیں میں نے کہہ دیا تھا "تو دُردرِ چہ گردی"

دیباچہ

میں نے اپنے ایک مخلص دوست سے کل یہ کہا
شاعری پر بھی مِری تیرا عقیدہ چاہیے
ہنس کے فرمایا کہ آخر صاف کیوں کہتے نہیں
مجھ کو دیباچے کی صورت میں قصیدہ چاہیے

شاعر

کل ایک مفکّر مجھے کہتا تھا سرِ راہ
شاید تِری ملّت کے ہے مٹنے کا ارادہ
میں نے یہ کہا اس سے کوئی وجہ بھی ہوگی
بولا کہ تری قوم میں شاعر ہیں زیادہ

دھمکیاں

چینیوں کو دھمکیاں دیتے ہیں جاتی کے سپوت

ناک پر انگلی رکھے کچھ سوز سے کچھ ساز سے

جی میں آتا ہے بقولِ جوشؔ یہ ان سے کہوں

"لے میں قرباں رَن میں نکلو گے اِسی انداز سے"؟

ہندی جنتا

ملاوٹ ہو گئی ہے اُس میں جَو کی

مقدّر میں جو روٹی رہ گئی ہے

پریشاں حال ہے نہرو کی جنتا

لنگوٹی ہی لنگوٹی رہ گئی ہے

انقلابی حکومت

کسی کو کسی سے نہیں ہے حسد
کسی کو کسی سے نہیں ہے گزند
اب ان کی حکومت ہے اے بے خبر
کہ تحت الثریٰ پر ہے جن کی کمند

انقلاب

یہ ہے لیڈر اور اس کی قسمت میں
جیل کی کوٹھری کا جھنگہ ہے
وہ تو خیر ابتدائی حالت تھی
اب تو موٹر ہے اور بنگلہ ہے

نسخہ

جھوٹ کہتا ہوں اور بے کھٹکے
کون سچ کہہ کے دار پر لٹکے
کیا کہیں کیسے آسماں سے گرے
اور کیوں کر کھجور میں اٹکے

جھُوٹ

ہم تو اس بات پر فدا ہو جس میں
اپنی بدنامی جھوٹ کہتے ہیں
یہ بڑے لوگ میرزا محمود
بین الاقوامی جھوٹ کہتے ہیں

سوداگر

کافروں نے کر دیا ہے داغدار
آج مذہب کے مقدّس نام کو
سامراجی ڈاکوؤں کے یہ نقیب
بیچتے ہیں حرمتِ اسلام کو

کالے چور

وبا کے ڈر سے سُنا ہے کہ کالے چور بھی آج
رفاہِ عام کے کاموں میں حصّہ لیتے ہیں
علاوہ ان کے کچھ ایسے بھی حق پرست ہیں جو
خدا کے نام پہ رشوت کا مال دیتے ہیں

ایک تاجر

ہے یہاں ایک ایسا سوداگر
گندگی کھاد کر کے بیچتا ہے
تیل دیتا ہے گھی کے داموں پر
لوہا فولاد کر کے بیچتا ہے

چور

گو مجھے معلوم ہیں خاموشیوں کے فائدے
کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑ جاتا ہے کیونکر چپ رہوں
مجھ سے فرماتے ہیں کچھ چوروں کی بابت بھی کہو
عرض کی میں آپ کا مارا ہوں اب کیونکر کہوں

غلط بخشی [۱]

خدا کی دین ہے وہ جس کو بخشے
کریں کیا یہ نہ تھی قسمت ہماری
بغاوت کے ترانے ہم نے گائے
مگر پکڑے گئے فارغ بخاری

واردات

دوستوں پر مجھے تعجّب ہے
آخرش کوئی واردات بھی تھی
وقت سے پیشتر ہی بھاگ گئے
وقت پر بھاگتے تو بات بھی تھی

---

[۱] ۵۴ء میں فارغ بخاری کی گرفتاری پر۔

گاندھی جی

کیا عجب ہے کہ ہم سا کوئی غریب
ایرے غیرے کے ہاتھوں مارا جائے
لیکن افسوس ہے کہ گاندھی جی
نتھو خیرے کے ہاتھوں مارا جائے

پنڈت نہرو

یہ ہے ارشاد نہرو کا کہ ہیں تو دوست ہوں سب کا
کسی کو مجھ سے آخر شکوۂ سود و زیاں کیوں ہو،
بھلا اب کون دلّی جائے پنڈت جی سے یہ کہنے
"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

لالچ

سیٹھ جی آپ کیسے کہتے ہیں
تیری حالت سنور نہیں سکتی
پیٹ بھر جائے گا مرا لیکن
آپ کی آنکھ بھر نہیں سکتی

گناہِ کبیرہ

ظلم کرنا گناہ ہے سچ ہے
بزدلوں کا یہی وطیرہ ہے
لیکن انساں کا ظلم سہہ لینا
وہ گنہ ہے کہ جو کبیرہ ہے

ذخیرہ اندوزی

نوبت اس حال پہ آپہنچی ہے زرداروں کی
مال تو مال ہے اب جان چھڑائے نہ بنے
یوں دبائے ہوئے بیٹھے ہیں وہ گندم کہ اگر
"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے"

راہزن

تم جنھیں راہزن سمجھتے ہو
جیل خانوں میں سڑ رہے ہیں آج
یہ بتاؤ کہ کیا کھو گے انھیں
جن کے ہاتھوں سے لٹ رہا ہے سماج

بی کلاس

ایک لیڈر یہ کہہ رہا تھا کل
اے حکومت کے کار پردازو
میری تقریر باغیانہ تھی
پھر مجھے بی کلاس میں بھیجو

تقریر

بڑے اہم مسئلے پہ تقریر ہو رہی ہے خدا کے بندو
فصاحت نون سن رہا ہوں بلاغتِ نون سن رہا ہوں
خبر نہ تھی مجھ کو میری ملّت میں ایسے ایسے بھی ہیں مقرّر
بس ایسا معلوم ہو رہا ہے جواب مضمون سن رہا ہوں

ملاوٹ

میں ہی لالچ میں کھا گیا ورنہ
ڈاکٹر مجھ سے روز کہتا تھا
وہ مٹھائی بچی ہے عید کے دن
جس سے گھی تیل بن کے بہتا تھا

مسلمانی

ٹھیک ہے ہوگی زمانے میں مسلمانی کبھی
کیا کہوں اب تو مسلماں کی یہ حالت ہوگئی
پوچھ لیتا ہے وہ پہلے میکدہ کا راستہ
جس مسلماں کو وراثت ملتی ہے اجداد کی

دستخط

یہ تو بابو ہیں جانور ہیں حضور
یوں ہی بے فائدہ پریشاں ہیں
آپ تھک جاتے ہونگے دفتر میں
دستخط کرنے اتنے آساں ہیں

کلرک

میں نے اپنا ضمیر بیچا ہے
اپنی اپنی جگہ ہیں سب محفوظ
جانتے ہو کہ اک کلرک ہوں میں
میرے جملہ حقوق ہیں محفوظ

بلدیہ پشاور

اگر کوچوں میں بھنگی رات کو جاروب کش پاؤ
تو جانو یہ بھی ہے اک نشانِ بیداری کمیٹی کی
غلاظت جب سڑک پر جابجا بکھری ہوئی دیکھو
تو سمجھو اس طرف سے گزری ہے لاری کمیٹی کی

سنگار دانی

وہ سوٹ کیس لئے پھر رہے ہیں ہاتھوں میں
نہ جانے کون سے فیشن کی یہ نشانی ہے
سبب جو پوچھا تو بولے تجھے خبر ہی نہیں
یہ سوٹ کیس نہیں ہے سنگار دانی ہے

جوانانِ وطن

کبھی تو اُن کی حسینوں سے شکل ملتی ہے
کبھی پناہ گزینوں سے شکل ملتی ہے
خدا کی شان ہے وہ ہیں مرے وطن کے جوان
کہ جن کی پردہ نشینوں سے شکل ملتی ہے

فرشتے

اے مرے دوست کہیں بھول نہ جانا ان پر
ان کی پیشانی پہ محراب بھی ہے مانتا ہوں
جن کے کہنے پہ گرفتار ہوئے تھے غالبؔ
وہ فرشتے یہ نہیں ہیں میں انھیں جانتا ہوں

مالی حالت

میرے محبوب ضد نہ کر اتنی
یہ جہالت خراب ہوتی ہے
تجھ کو معلوم ہے کہ شاعر کی
مالی حالت خراب ہوتی ہے

شرافت

دنیا جسے کہے یہ بہت ہی شریف ہے
سمجھو کہ وہ رئیس ہے سرمایہ دار ہے
جو بے سبب ذلیل ہو سب کی نگاہ میں
جانو وہ مفلسی کے مرض کا شکار ہے

انجمن آرائی

میں نے اک دخترِ ملت سے یہ اک روز کہا
حسن کی اپنے نہ اس طرح سے رُسوائی کر
ہنس کے کہنے لگی اقبالؔ نے فرمایا ہے
"پردہ چہرے سے ہٹا انجمن آرائی کر"

جھونپڑوں کی آگ

ساتھ دیں کیونکر نہ محتاجوں کا آج
اہلِ زر کو کیوں نہ ہو خوف و ہراس
بات یہ ہے جھونپڑوں کی آگ اب
پھیل کر پہنچی ہے ایوانوں کے پاس

چراغ

بجلی جس روز فیل ہوتی ہے
وہ بھی اُس روز آ نکلتے ہیں
سر پٹکتے ہیں لوگ اندھیرے میں
میرے گھر میں چراغ جلتے ہیں

امیر

اے بے خبر، خبر ہی نہیں اسکی کچھ تجھے
یہ لوگ شک نہیں کہ بڑے بے نظیر ہیں
گر مانگنا ہی ہے تو غریبوں سے جا کے مانگ
جو اگلی صف میں بیٹھے ہیں سارے امیر ہیں

جوابِ باثواب

کسی رہ رَو نے از راہِ ترحّم ایک مفلس سے
جو پوچھا خاک میں کیوں لوٹتا ہے اور روتا ہے
کہا اے بے خبر اب تک نہیں معلوم یہ تجھ کو
"کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے"

اہلِ زر

اہلِ زر وہ خدا پرست ہیں جو
دولتِ لازوال دیتے ہیں
وعدے کرتے ہیں اہلِ حاجت سے
اور دعاؤں پہ ٹال دیتے ہیں

ریزرویشن

جگہ مل جائے گی ضرور تجھے
کیوں ترے دل میں اس قدر ڈر ہے
اے مرے دوست اب ریزرویشن
ریلوے کے قلی کی چادر ہے!

مہربانی

میری بربادیوں کا حال نہ پوچھ
یہ بڑی مختصر کہانی ہے
کچھ زمانے کے حادثات ہیں دوست
اور کچھ ان کی مہربانی ہے

رمضان

روزے آنے کو ہیں کہتا تھا کوئی کل ہم سے

روزہ داروں پہ فرشتوں کا گماں ہوتا ہے

عرض کی اُن کی بھی تفصیل بتا جن کے لئے

سال کے بارہ مہینے رمضاں ہوتا ہے

روزہ

اس مہینے مری طبیعت میں

اک عجب انقلاب ہوتا ہے

میرے محبوب مسکرا کے نہ دیکھ

میرا روزہ خراب ہوتا ہے

اندھے

مستحق ہو تو چاہیئے امداد
لوگ اس پر بھی ہچکچاتے ہیں
ایسے اندھے بھی ہم نے دیکھے ہیں
صاف کھوٹا کھرا بتاتے ہیں

چائے

اب تو ہم بھی ہیں صاحب ایجاد
اب تو ہم بھی دعائیں لیتے ہیں
رنگ دے کر چنوں کے چھلکوں کو
چائے کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں

زندہ باد

کہہ رہا تھا ایک لیڈر ایک نعرہ باز سے
جانتے ہو کیا مری تقریر کا مفہوم ہے
تم تو "زندہ باد" کہہ کر گھر چلے جاؤ گے دوست
بعد میں جو مجھ پہ گزرے گی مجھے معلوم ہے

فردِ جرم

گماں ہوتا ہے جب مومن پہ کافر کا تو یہ سمجھو
کہ اس نے اپنے گھر میں محفلِ میلاد کی ہو گی
جسے اس دور میں تم جیل کو جاتے ہوئے دیکھو
تو یہ جانو کہ اس کم بخت نے فریاد کی ہو گی

فوٹو

تو جو موجود ہے تو اے واعظ
تیرے فوٹو کی کیا ضرورت ہے
کچھ تو موسم خراب ہے یوں بھی
اور کچھ تو بھی خوبصورت ہے

تقابل

شیخ جی تجھ کو مجھ سے کیا نسبت
میری ہر آرزو بدلتی ہے
میرے دل سے نکلتی ہے جو دعا
وہ ترے پیٹ سے نکلتی ہے

سرمہ

عرض کی آپ کو کیوں اتنا ہے سرمے سے لگاؤ
ہنس کے بولے کہ یہ سرچشمۂ بینائی ہے
آج ہم سمجھے کہ اس ضعفِ بصارت کے سبب
"کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے"

گرمیاں

گرمیاں آئی ہیں اس ڈھب سے کہ توبہ توبہ
بس نہانے کے سوا کچھ بھی بنائے نہ بنے
اسی موسم میں کہا کرتے تھے شاید غالب
"ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

عاشق کا گریباں

کپڑے کی گرانی پہ کہیں بھی تو کہیں کیا
ظاہر ہے کہ ارزاں کوئی عنواں نہیں ہوتا
اس دور میں تسلیم یہ کرنا پڑا ہم کو
سنتے تھے کہ عاشق کا گریباں نہیں ہوتا

مجبوری

صرف ہو جاتا ہے آقاؤں پہ
نصف حصہ مری مزدوری کا
پھر بھی پڑھتا ہوں قصیدے انکے
شکریہ نام ہے مجبوری کا

عادت

مت پوچھ مرا حالِ خراب اے ساقی
عادت بھی ہے اک گونہ عذاب اے ساقی
کھانے کے لئے ملتی نہیں ہے روٹی
پیتا ہوں مگر روز شراب اے ساقی

میخواری

مجھ سے واعظ کو شکایت ہے کہ میخوار ہوں میں
ان سے پوچھے کوئی مے پینے سے کیا ہوتا ہے
رات کو وعظ میں وہ خود ہی تو فرماتے تھے
"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"

بات

خوب تڑپا کے بات کرتے ہیں
یعنی ترسا کے بات کرتے ہیں
جو بھی کہنا ہو بھول جاتا ہوں
جب وہ شرما کے بات کرتے ہیں

صفائی کا ہفتہ

تکلّف کی اتنی ضرورت بھی کیا تھی
مجھے تیرا انداز بھایا ہوا ہے
خدا جانے کیوں میرے محبوب تو نے
صفائی کا ہفتہ منایا ہوا ہے

حلفِ وفاداری

حلف اٹھا لینے کے فوراً بعد ہر تازہ وزیر
قائدِ اعظمؒ کے مرقد پر بھی جاتا ہے ضرور
اور وہاں جا کر یہ کہتا ہے وہ ان کی روح سے
"میرے ہاتھوں قوم اچھا دن نہ دیکھے گی حضور"

تنقید

سوائے ایک شخصیت کے جو محبوب ہے سب کو
سیاست داں تو کیا میں انکے ناموں سے بھی ڈرتا ہوں
مری تنقید میں مضمر ہے اک تعمیر کی صورت
مگر میں آج کل تعمیری کاموں سے بھی ڈرتا ہوں

کاتب

کبھی تو اپنا مصرع بھی نظر آتا نہیں اپنا
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا اندھیر گردی ہے

ہمارے شعر میں کچھ بھی کہیں کھٹکے اگر تم کو
تو یہ سمجھو کہ کاتب نے وہاں اصلاح کر دی ہے

قبالہ

کوئی اس کو اہم کہے نہ کہے
میرے حق میں تو یہ قبالہ ہے
ان کی ہر ایک بات میں محمودؔ
میرے اشعار کا حوالہ ہے

پہچان

شیخ جی آپ کو تو لے دے کر
چند حجرہ نشین جانتے ہیں
ہم فقیروں کو دیکھیئے کہ ہمیں
شہر بھر کے حسین جانتے ہیں

ترنم

شیخ جی ان پہ کیا اثر ہوگا
جو نصیحت کے وقت سوتے ہیں
اس لئے جب بھی رونا آتا ہے
ہم ترنم کے ساتھ روتے ہیں

اوقاف کمیٹی

مسجد کی دکانوں کے کرائے سے غرض ہے

اس سے نہیں مطلب کہ چٹائی ہے دریدہ

حیراں ہیں ہم اس پر کہ کہیں تو کسے جا کر

اوقاف کمیٹی تیرے اوصافِ حمیدہ

جلسے

اب جہاں جلسہ کیا جاتا ہے

پہلے قرآن پڑھا جاتا ہے

بعد میں نظمیں سنی جاتی ہیں

اور پھر جھوٹ کہا جاتا ہے

دانائے راز

یہ نسخے ہیں مری باتیں نہیں ہیں
خبر تم کو نہیں ہے اس کی شاید
کہو تو راز کہہ دوں خلوتوں سے
"دگر دانائے راز آید کہ ناید"

دھوکا

وہ بھی مجھ کو بزرگ کہتے ہیں
مَیں بھی کہتا ہوں ان کو برخوردار
وہ بھی جھوٹے ہیں مَیں بھی جھوٹا ہوں
"وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار"

پے کمیشن

او غریبوں کی جاگ اٹھی قسمت
اب تو اوڑھیں گے یہ بھی دو نالے
پے کمیشن نے موج میں آکر
ایک دم دو رُوپے بڑھا ڈالے

بِل

ہر ایک بات پہ بل پاس ہو رہے ہیں یہاں
ہر ایک بات پہ بل پیش ہوتے جاتے ہیں
غریب قوم کے افراد آئے دن محمود
خدا کے فضل سے درویش ہوتے جاتے ہیں

خوش فہمی

مآل اندیشیاں تو کیا اسے سادہ دلی کہئے
کہ اتنی بھی سمجھ باقی نہیں ان حق پرستوں میں
بڑھاپے میں کمائی کی توقع ان سے رکھتے ہیں
نصابوں کے بجائے ناولیں ہیں جن کے بستوں میں

نئی پود

ہمیں حیرانگی تھی اس لئے ہم پوچھ ہی بیٹھے
یہ لڑکے شیخ جی کیوں آپ پر آوازے کستے ہیں
کہا ہنس کر کہ بھائی یہ ترقی کا زمانہ ہے
میں کیا شے ہوں یہ اپنے باپ پر آوازے کستے ہیں

نمازِ عید

ادھر عوام نابلد، اِدھر امام بے خبر
کوئی کہیں رکوع میں کوئی کہیں سجود میں
پھنسے تھے عید گاہ میں عجیب کشمکش میں ہم
خدا کا شکر ہے کہ وقت کٹ گیا درود میں

نمازِ جمعہ

گھر کو تنبیج دیں گے مسجد پر
خواہ کافر ہی کیوں نہ کہلائیں
جمعہ کے دن نماز پڑھتے ہیں
آجکل جن کے بوٹ پھٹ جائیں

ایم - ایل - اے

کہہ رہے تھے یہ ایک ایم - ایل - اے
ہم کو بھی اک بیان لکھ دیجے
سوچتا ہوں کہ کیا کہوں ان کو
ترجماں ہیں یہ ملک و ملّت کے!

ممبری

کیوں وہ غصّہ نہیں جلال نہیں
کیوں طبیعت میں اشتعال نہیں
میرے محبوب ماجرا کیا ہے
ممبری کا تو کچھ خیال نہیں؟

سانڈے کا تیل

اب کیا کہیں کہ یہ تو حکومت کا فرض ہے
ہم کچھ کہیں تو ہم پہ بھی الزام آئے گا

سانڈے کا تیل بیچتی پھرتی ہیں عورتیں
اور مرد پوچھتے ہیں یہ کس کام آئے گا

کالے چشمے

کالے چشمے بھی ایک نعمت ہیں
دھوپ میں خوب کام دیتے ہیں
جو نگاہیں ملا نہیں سکتے
رات دن ان سے کام لیتے ہیں

نمائش

عورتوں کا بھی نمائش میں ہے اک مخصوص دن
لوگ بھی ہیں اس پہ خوش اور مہتمم بھی شاد ہیں
مرد کا سایہ نظر آتا نہیں ہے دور دور
صرف اسٹالوں پہ ساڑھے تین ہزار افراد ہیں

داد

واقعی کام کیا ہے اس نے
ہم سے لوگوں نے روایت کی ہے
اس کی تصویر ہے اخباروں میں
جس نے پردے کی حمایت کی ہے

نوکری

نوکری کیلئے اخبار کے اعلان نہ پڑھ
جان پہچان کی باتیں ہیں کہا مان نہ پڑھ
جن کو ملنی ہو انھیں پہلے ہی مل جاتی ہے
بس دکھاوے ہی کے ہوتے ہیں یہ فرمان نہ پڑھ

درخواستیں

کچھ تو پچھلے برس کی ہیں ان میں
کتنی درخواستیں پڑھیں گے حضور
ہم تو راضی ہیں آپ اگر کہدیں
آدھی منظور آدھی نا منظور

اُمّید

یہ تو تنخواہ ہے غریبوں کی
فکر کی اس میں بات کیا ہے خصوصاً
اور دو چار سال بعد سہی
ہم کو معلوم ہے بڑھے گی ضرور

حق پرست

وبا کے ڈر سے سنا ہے کہ کالے چور بھی آج
رفاہِ عام کے کاموں میں حصّہ لیتے ہیں
علاوہ ان کے کچھ ایسے بھی حق پرست ہیں جو
خدا کے نام پہ رشوت کا مال دیتے ہیں

دورے

سلوک اپنوں کا بھی بیگانوں کی صورت ہو جب ہم سے
تو اس صورت میں کیوں تکیہ نہ ہو پھر اپنا اوروں پہ
ہے ان کے دل میں بھی چاہت ہماری، پر ہے مجبوری
ہم ان سے کس طرح پوچھیں کہ وہ رہتے ہیں دوروں پر

اصلاح

میری مانند اس کے کوچے سے
شیخ جی بھی گزرتے رہتے ہیں
اپنی اصلاح کر نہیں سکتے
مجھ پہ تنقید کرتے رہتے ہیں

ریڈیو

جن کو انگریز کا قانون ہے ازبر، اُن سے
اور سب پوچھ مگر شرع کے احکام نہ پوچھ
ریڈیو میں بھی جو قرآں کی تلاوت نہ سنیں
ان مسلمانوں کی اولاد کا اسلام نہ پوچھ

بھرتی

سنا ہے ایک کے بدلے میں چھ بھرتی کرینگے وہ
مگر یہ ہندوؤں کے لیڈروں کی خام کاری ہے
خبر اب تک نہیں ہے اس حقیقت کی انھیں شاید
ہماری ایک روٹی انکے چھ پھلکوں پہ بھاری ہے

اشتہار

غریب فاقہ کشوں پر ستم ہوئے ہیں بہت
خبر ہے مجھ کو، مگر صاف کیا لکھوں
ملوں کے مالکوں سے اشتہار ملتے ہیں
یہ سوچتا ہوں کہ ان کے خلاف کیا لکھوں

ٹیلیفون

کہہ دیا ٹیلیفون نے سب کچھ
وہ چھپاتے تھے حال محرم سے
جانے وہ کس سے بات کرتے تھے
مل گیا آ کے سلسلہ ہم سے

غلماں

ہے تیرے لئے تو وہاں ہر طرح کا آرام
کچھ میرے لئے عیش کے ساماں بھی ہونگے
زاہد مجھے فردوس کی تفصیل بتا دے
حوریں ہی فقط ہوں گی کہ غلماں بھی ہونگے

سفید پوش

بھوک کے ہاتھوں چل نہیں سکتے
لوگ کہتے ہیں بادہ نوش ہیں ہم
سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا
آج کل کے سفید پوش ہیں ہم

خاتونِ پاکستان

لیڈروں سے ہے گِلہ خاتونِ پاکستان کو
اور مجھے خاتونِ پاکستان سے ہے اختلاف
کس طرح ان مفتیوں کو چور میں سمجھوں کہ جو
کر چکے ہیں قائدِ اعظم کے مرقد کا طواف

فقیر

میری تقدیر میں کیا ہے یہ خدا جانتا ہے
جب تو کہتا ہُوں حقارت سے فقیروں کو نہ دیکھ
وقت کے ساتھ ہی حالات بدل جاتے ہیں
اے منجّم میرے ہاتھوں کی لکیروں کو نہ دیکھ

قائدِ اعظمؒ

مَیں نے اِک صاحب سے پوچھا ایسی حالت تو نہ تھی
قوم کے سر پر تھا جب تک قائدِ اعظم کا ہاتھ
ہنس کے فرمانے لگے مجھ سے کہ سن اے بے خبر
قائدِ اعظم کی باتیں قائدِ اعظم کے ساتھ

لیاقت علی خان

سنتا ہوں ہو گئے ہیں لیاقت علی شہید
کہتے ہیں جا بہ جا یہ مسلماں دعا کے بعد
مرتے ہوئے بھی قوم کو پیغام دے گئے
"اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

سردار عبدالرب نشترؔ

میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا مگر
لوگ سمجھے تھے اس کو بے پر کی
لیگ کے جسم پر جو پھوڑے ہیں
اب ضرورت ہے ان کو نشتر کی

عبدالقیوم خان

کوئی کہتا ہے اب اسے فرعون
کوئی کہتا ہے اب اسے شدّاد
مر گئے ہیں کہاں، جو کہتے تھے
خان قیّوم خان زندہ باد!

قرآن

سب کچھ ہے قرآن ہمارا

خواب میں یا بیداری میں ہے

برسوں سے یہ گھر میں ہمارے

شیشے کی الماری میں ہے

دستوری

اسے مِن فضلِ ربّی کہتے ہیں جو خوش عقیدہ ہیں

مگر کچھ بے عقیدہ اس کو مزدوری بھی کہتے ہیں

کئی اک نام رشوت کے مجھے معلوم تھے لیکن

سنا ہے اب کہ چونگی والے دستوری بھی کہتے ہیں

حج

یہ وہی تقویٰ دار مولوی ہیں
جو ہر اک سال حج کو جاتے ہیں
ان کی بخشش میں شک نہیں ہے کوئی
ہر برس ساٹھ سوٹا لاتے ہیں

مِڈل فیل

اک مسلمان مصنّف کا حوالہ دے کر
کسی انگریز مصنّف نے بھی کچھ لکھا ہے
بائرن نے یہ کہا ہے یہ میکالے نے کہا
جس مڈل فیل کو دیکھو وہ یہی کہتا ہے

شربتِ دیدار

جب تو ہر روز اسی سمت نکل جاتے ہیں
روح خوش ہوتی ہے اور غنچۂ دل کھلتا ہے
اک پری چہرہ نے لکھا ہے دکاں پر اپنی
آئیے شربتِ دیدار یہاں ملتا ہے

ضرورت

تذکرہ ہے ہر ایک شاعر کا
گر نہیں ہے تو میرا ذکر نہیں
ایک شاگرد کی ضرورت ہے
خوبصورت بھی ہو تو فکر نہیں

دودھ اور پانی

محتسب سے کہوں تو کیا جا کر
میری مانند وہ بھی روتا ہے
پہلے ہوتا تھا دودھ پانی میں
آج پانی میں دودھ ہوتا ہے

پھلکے

دیکھیے نانبائیوں کا کمال
خوب سوچا ہے سب نے مل جل کے
اٹھتے ہی کنٹرول آٹے کا
روٹیوں کے بنا دیئے پھلکے!

ریڈیو اور مسلمان

دیکھئے کیا رنگ لائے یہ پسند
نت نئے فیشن ہمیں بھانے لگے
بیبیاں قوالیاں کرنے لگیں
اور شوہر وجد میں آنے لگے

انگریزی

ہم غریبوں سے آپ کیوں صاحب
مفت کے جھگڑے مول لیتے ہیں
آپ کی طرح سے تو انگریزی
خانسامے بھی بول لیتے ہیں

کپڑوں کے داغ

شیخ جی شکر کیجیے اس پر
اس زمانے میں کم ہے جو کچھ ہو
آپ کپڑوں کے داغ دیکھتے ہیں
اور میں رو رہا ہوں کپڑوں کو

تہذیب

حرام ہے مرے مذہب میں بادہ خواری بھی
میں جانتا ہوں یہ تخریب کی نشانی ہے
خبر نہیں مری مجبوریاں تجھے زاھد
میں کیا کروں کہ یہ تہذیب کی نشانی ہے

ٹیکس

گھر تو باقی نہیں سڑکوں ہی پہ ڈیرا ہو جائے
اور اِک ٹیکس لگا دو کہ سویرا ہو جائے

رہزنو، لوٹنا ہے ہم کو تو بے شک لوٹو
لیکن اتنا تو ٹھہر لو کہ اندھیرا ہو جائے

فریاد

تجویز کر رکھا تھا پہلے سے جو کرایہ
آیا جو دوسرا تو اس نے مزید داغا

اس ٹیکس نے تو ہم کو برباد کر دیا ہے
فریاد ہے ہماری عبدالحمید[1] آغا

[1] سابق کمشنر پشاور۔

حقیقتِ حال

دوست احباب مجھ سے نالاں ہیں
رنگ لا کر رہے گا میرا جنوں
سکھ تو بارہ بجے کے بعد ہے سکھ
مجھ کو دیکھو کہ ہر گھڑی سکھ ہوں

روگ

روگ ایسا لگا کہ اب تو مجھے
اپنا جینا بھی بوجھ لگتا ہے
رات سب کھانستے گزرتی ہے
اور دِن ہانپتے گزرتا ہے

فرار

حملہ کرتے ہی، مہاشے پٹ گئے،
فوج لیں ویروں نے ان کی بوٹیاں
غاصبوں پر ہم نے جب یلغار کی
بھاگ نکلے چھوڑ کر لنگوٹیاں

فتوے

سمجھتے تھے کہ نا اہلی کے فتوے
ہمارے ہی لئے کچھ سہل ہوں گے
خبر اس کی نہ تھی محمود ہم کو
وزیروں میں بھی کچھ نا اہل ہونگے

ایڈیٹر

تم کیسے ایڈیٹر ہو یہ سمجھاؤ تو ہم کو
کوئی نظر آتا نہیں مضمون تمہارا
عینک کو گھماتے ہوئے از راہِ تفنّن
بولے کہ ایڈیٹر تو تخلّص ہے ہمارا

اہلِ قلم

شکایت کبھی بھول کر بھی نہ کرنا
اگر جیب خالی ہے دام و درم سے
انھیں مَیں نے محتاج دیکھا ہے اکثر
جواہر ٹپکتے ہیں جن کے قلم سے

دعا

الٹا ہوا کرتا ہے کہا اپنا ہمیشہ
اب کیا کوئی سمجھے گا کہ کیا مانگ رہے ہیں
بارش کی دعا کرتے ہیں آجاتی ہے آندھی
اس واسطے آندھی کی دعا مانگ رہے ہیں

شباب

کیا خوب کی شباب کی تفسیر شیخ جی
تخریب میں حوالۂ تعمیر دے گئے
مانگی تھی میں نے آپ سے اک ان کی یادگار
چالیس سال پہلے کی تصویر دے گئے

شاعری

جانے کیوں لوگ انھیں سن کے بھڑک اُٹھتے ہیں
جانے کیوں لوگ انھیں پڑھتے ہی مسکائے ہیں
میرے اشعار کا مطلب مرے محبوب نہ پوچھ
یہ تو میں نے بھی کسی اور سے لکھوائے ہیں!

شاعر ساز

اس کی تعریف کیا کروں تم سے
اس کی تعریف مجھ سے مت پوچھو
جو اسے دیکھ لے غزل کہہ دے
یہ ضروری نہیں وہ شاعر ہو

مجید لاہوری

دو دن بھی نہ گزریں گے کہ انصاف کے حامی
رمضانی کو فٹ پاتھ پہ سونے بھی نہ دیں گے
اب ان کو نمکداں کے ایڈیٹر کا نہیں ڈر
چاہے گا اگر رونا تو رونے بھی نہ دیں گے

کرکٹ

چھوڑ "دستور" کے جھنجٹ کو یہ بے فائدہ ہے
چل کے دکھلاؤں تجھے کھیلتا ہے کیسے وقار
پہلے عورت ہی ہمارے لئے سب کچھ تھی مگر
ان دنوں قوم کے اعصاب پہ کرکٹ ہے سوار

پرمٹ

ہماری اتنی استعداد ہوتی تو دکھا دیتے

بتائیں کیا تمھیں غنچہ چٹکتا ہے کہ کھلتا ہے

مناسب ہے کہ عبدالحق[1] سے جا کر پوچھ لو پہلے

سنا ہے آج کل اردو کا پرمٹ ان سے ملتا ہے

چراغ حسن حسرت (مرحوم)

کیونکر گلہ کرے ملک الموت سے کوئی

قدرت نہیں ہے ورنہ ضرور اس سے پوچھتا

تو ہی بتا چراغ حسن کے سوا یہاں

کیا ہم میں اور کوئی بڑا آدمی نہ تھا

[1] بابائے اردو مولوی عبدالحق۔

ڈاڑھی

ڈاڑھی رکھ کر تو شیخ جی ۔ انساں
سایۂ زلف میں نہیں سوتا
ریش پہ ہاتھ پھیر کر بولے
ڈاڑھی والے کا دِل نہیں ہوتا

وزارت

نہ تیرے پاس سند ہے نہ تیرے پاس ہنر
اس لئے پہلے تجارت کے لئے کوشش کر
جب تجارت میں بھی دیکھے کہ خسارہ ہے تو پھر
اَے مرے دوست وزارت کے لئے کوشش کر

فن کار

مرتبہ پہچانو میرا دوستو
مَیں بھی اپنے عہد کا فن کار ہوں
قوم کا سرمایہ کہتے ہیں مجھے
اور پائی پائی کو محتاج ہوں

دمہ

یوں تو لقمان مرے دیس میں لاکھوں ہیں مگر
دمہ اِک ایسا مرض ہے کہ نہیں جس کی دوا
زہر بھی کھایا تو اس میں بھی ملاوٹ پائی
"میں نے چاہا تھا کہ مر جاؤں سو وہ بھی نہ ہُوا"
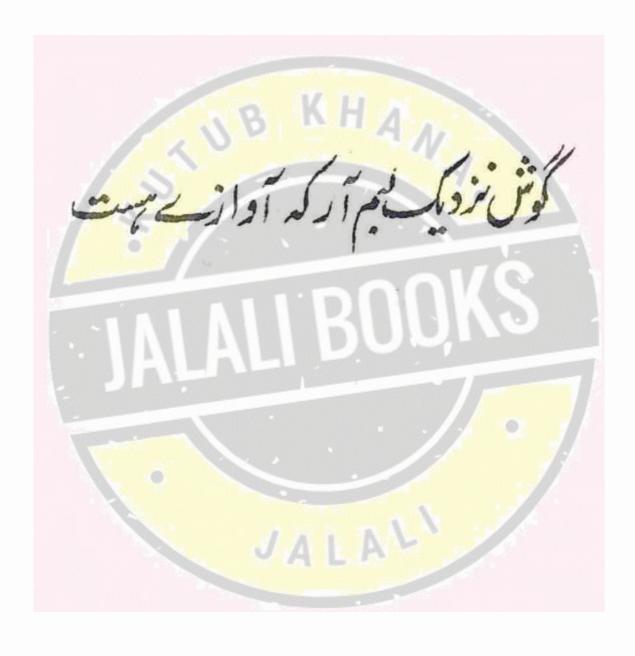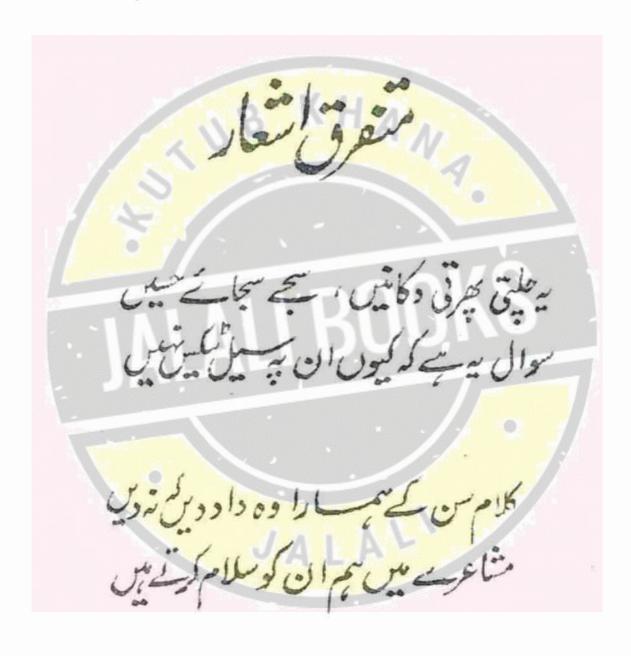
متفرق اشعار

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

متفرق اشعار

یہ چلتی پھرتی دکانیں، سجے سجائے حسین
سوال یہ ہے کہ کیوں ان پہ سیل ٹیکس نہیں

کلام سن کے ہمارا وہ داد دیں کہ نہ دیں
مشاعرے میں ہم ان کو سلام کرتے ہیں

ہو اعتراف گناہوں کا آپ کو کیسے
سفید پوش کہے گا سیاہ کار ہوں میں

وہ اپنے حسن کے بارے میں کچھ نہیں کہتے
ہمارے نوٹ کو جعلی قرار دیتے ہیں

حل ہو سکا نہ ہم سے معمہ یہ آج تک
روٹی کا غم کریں کہ حسینوں کا غم کریں

زباں کے بدلے نگاہوں سے کام لیتے ہیں
وہ بات بھی نہیں کرتے ہیں بات کے بدلے

کیا کہیں گیسو بنانے میں وہ کتنے فرد ہیں
پشت کی جانب سے عورت سامنے سے مرد ہیں

کیا کہیں کیا چیز ہیں وہ یہ نہ ہم سے پوچھئے
ورنہ پھر تہذیب کی حد سے گذر جائیں گے ہم

شراب خانے کی رونق ہمارے دم سے ہے
ہمارے دم کا بھرم آپ کے کرم سے ہے

توبہ کا اعتبار ہی کیا ہے بہار میں
ہم اس سے بیشتر بھی قسم کھا کے پی گئے

آپ پر ہم کو پیار آ ہی گیا
دل تھا بے اختیار آ ہی گیا

نہ ہم پر کفر کے فتوے لگاتا اس طرح زاہد
اگر اس کو خبر ہوتی جوانی کس کو کہتے ہیں

لندن میں دھوم تھی مرے اشعار کی بہت
لیکن یہ قہر تھا کہ کوئی ترجماں نہ تھا

پیر صاحب کہہ رہے ہیں دیر سے ھَل مِن مزید
اور ستم یہ ہے سمجھ سکتے نہیں اِس کو مرید

دفتر دکھا دِیا مجھے بھرتی کا اور کہا
اِس دور میں بھی تجھ کو غمِ روزگار ہے

ہمیں ان سے جوانمردی کی امیدیں ہوں کیا جن کی
مسیں بھیگی نہیں ہیں اور حجامت کی تمنا ہے

سوٹ سلوانے کو یوں تو سِل گیا
بِل جو دیکھا تو کلیجہ ہِل گیا

محمودؔ کا کیا پوچھتے ہو پوچھنے والو
گھر بیچ کے پگڑی پہ مکاں ڈھونڈ رہا ہے

جو ملی ایوب کی صورت ہمیں
ہے سزا یہ شامتِ اعمال کی

دینِ حق کو کرو نہ یوں بدنام
زر پرستی کہاں کہاں اسلام

جتنے بھی گُر ازبر تھے سب طاقِ نسیاں ہو گئے
جب جنگ ہم سے چھیڑ کر الا لے پریشاں ہو گئے

دیکھو مجھے دزدیدہ نگاہوں سے نہ دیکھو
اتنا نہیں بدنام کہ جتنا ہوں میں مشہور

ہم ڈپٹی کے بھائی کو سمجھتے نہیں ڈپٹی
اس واسطے معتوب ہیں اس واسطے مقہور

پھر مچلتا ہے دل کہ سچ کہہ دیں
پھر حوالات ہونے والے ہیں

تیری صورت پہ مجھے پیار تو آتا ہے مگر
قیس و فرہاد کے افسانے سنے ہیں میں نے

شیروانی تو پہن لوں کہ ہوں شاعر لیکن
اس سے ڈرتا ہوں کہ قوال سمجھ لے نہ کوئی

پھر ستائے گا نہ ہرگز تجھے دولت کا خیال
میرے محبوب کے باپ کو مرنے دے ذرا

چاہنے والوں کی ہوتی جو ضرورت ان کو
بند اس طرح سے بھرتی کے دفاتر ہوتے

نام سے اپنے چھپا کر مرا دیوان منعم
مجھ سے کہتا ہے کہ میں زندۂ جاوید ہوا

ہم اس خطاب سزاوار ہو گئے جو کہا
حضور آپ کی رشوت کو فیس کون کہے
یہ لوٹ اچھا ہے پر کیا کریں کہ سستا ہے
خرید لیں تو ہمیں پھر رئیس کون کہے

ہم انھیں دردِ دل سناتے ہیں
لوگ ادھر واہ واہ کرتے ہیں
شیخ جی تم تو اپنے ہوش میں تھے
ہم تو پی کر گناہ کرتے ہیں

نجانے کس لیئے ڈرتے ہیں اتنا
مرے گھد رسے بیہ پشمینے والے

والدین مبتلا ہیں فالج میں
لڑکیاں پڑھ رہی ہیں کالج میں

انگریزی پڑھ کے لڑکیاں بے باک ہو گئیں
دھوئی گئیں وہ اتنی کہ بس پاک ہو گئیں

خواہ کتنے ہی اوج پر پہنچے
عورت عورت ہے اور مرد ہے مرد

اپنے مرکز سے ہٹ گئی دنیا
گورے کالے میں بٹ گئی دنیا

سوچتے ہی نہیں ہیں زر کے سوا
ہے یہی ان کا مذہب یہی ہے خدا

بجائے پھولوں کے سونا چڑھاؤ قبروں پہ
تو ان کی روحوں کو شاید کہیں قرار آئے

کیا کیا نہیں یہ کرتے پھرتے بیچارے
مذہب کو بیچتے ہیں یہ پیٹ کے پجاری

ہیں یہاں پر سامراجی جب تلک
یہ جہاں آباد ہو سکتا نہیں

پھرتی رہتی ہے پیچھے خفیہ پولیس   قافیہ تنگ ہوتا جاتا ہے

کون ہے جو نہیں ترقی پسند
کر لو۔ کتنے کرو گے جیل میں بند

یہی ہیں گر سیاسی رہنما تو
ہماری قوم کا اللہ حافظ

آرام جاں کھوں گا بہر حال میں تجھے
ماں باپ کی طرف سے ترا نام کچھ بھی ہو

مخلص سمجھ کے جس سے کہا حال مفلسی
اس نے سمجھ لیا کہ اسے قرض چاہیئے

تمہیں کہو کہ تمہیں جب بھی ہم سے پیار نہ تھا
ہمارا جرم غریبی جب آشکار نہ تھا

کاش اتنا ہی تجھے ہوتا مری الفت کا پاس
جس قدر ہوتی ہے چاندی سکۂ انگریز میں

وہ بات بات پہ کافر بنا رہے ہیں مجھے
خبر نہیں ہے کہ معیارِ کافری کیا ہے

سوال یہ ہے انہیں شیخ جی خبر ہی نہ تھی
سفید ریش یہاں تک سیاہ دل ہو گئے

سمجھ لو یا تو عاشق ہے نہیں تو قرض ہے اس پر
محاذِ جنگ پر جا کر جو لیڈر جاں لڑاتا ہے

کہا میں نے کہ میری جان بھی کام آئیگی تیرے
تو بولے مال کے بارے میں بھی ارشاد کر دیجے

دِل مرا پہلو میں پھڑکے تو نہ کیوں کر پھڑکے
تجھ پہ سو لڑکیاں قربان ارے او لڑکے

کسی کو جرأتِ اظہار ہی نہیں سرکار
اگرچہ میرے شریکِ سخن کچھ اور بھی ہیں،
وطن میں اپنے نہیں میں ہی اک تباہ گزین
مری طرح مرے اہلِ وطن کچھ اور بھی ہیں

نہیں کھلتا یہ عقدہ آج تک کیا شے ہے یہ لیڈر
کہ باتیں فقر کی کرتا ہے اور بنگلے میں رہتا ہے

پہنچا کے سرِ دار شہیدانِ وفا کو
اب ان کیلئے مرثیہ خواں ڈھونڈ رہے ہیں

تری زباں کی تیزی کا معترف ہوں میں شیخ
جو سچ کہوں تو سوا ہے یہ نیش عقرب سے

اب وفاداری کہوں یا اس کو مجبوری کہوں
رفتہ رفتہ ٹیکس کو کہنے لگے نذرانہ ہم

ان کو پہلے ہی خبر ہے اس کی
حال دل ان سے کہوں تو کیسے

اب تسلی کے واسطے ان کی
اک خدا کی کتاب باقی ہے

شاعری میں نے چھوڑ دی محمود
ایک شاعر نے جب غزل گائی

ہر ستم اپنے دل پہ سہتے ہیں
ہم بہر حال ہنستے رہتے ہیں

جانتا ہوں رقیب کو اپنے
ہاتھ میں ذوالفقار ہو بھی تو کیا

خبر نہیں ہے کسی کو مگر وہ جانتے ہیں
کہ ہار کر بھی انھیں بار بار جیتے ہیں

جو آپ مے کو برا سمجھتے ہیں شیخ صاحب تو خیر سمجھیں
جواب میں آپ ہم سے بھی کچھ سنیں دلیلیں تو کیا مزا ہو

عرض کی میں نے کہ آخر چھپ کے جاؤ گے کہاں
ہنس کے فرمایا ترے دل میں اتر جائینگے ہم

وہ داد حسن کی اب لے رہے ہیں دنیا سے
دکھا کے عہدِ گزشتہ کی اپنی تصویریں

ستم تو یہ ہے کہ وہ بھی ہمارے بس میں نہیں
جو دل ملا تھا ہمیں کائنات کے بدلے

بیباک تھا جب پیرہنِ مجنوں کا وہ دِن اور تھے
اب تو مجنوں پر بھی ہو جاتا ہے لیلےٰ کا گماں

ہم نے یہ مانا کہ آخر کار مر جائیں گے ہم
آپ کو تو زندۂ جاوید کر جائیں گے ہم

تمھیں تو چارہ گرو کچھ بھی وہ نہیں کہتے
مخاصمت جو کوئی ہے انھیں تو ہم سے ہے

زباں ہلاتے ہی لگتے ہیں کفر کے فتوے
اب اپنا سلسلہ اِک ایسے محترم سے ہے

ہوش میخانے کے دروازے پہ آتا ہو جنھیں
چھوڑ دینگے وُہ خدا بات بہت مشکل ہے

جن کو آتے ہوں غلامی میں حضوری کے مزے
ترک کر دینگے خطا بات بہت مشکل ہے

وہی بات مجھ کو لکھ دے جو زباں سے کہہ رہا ہے
مجھے ڈر ہے مسکرا کر کہیں پھر بدل نہ جائے

زلفیں بکھیر دے مرے شانوں پہ آج رات
تیری بلا سے پھر مرا انجام کچھ بھی ہو

جو حسیں ملتا ہے سینے سے لگا لیتے ہیں ہم
عید پہ ناواقفیت کا سوال آتا نہیں

نہ جا اس سوٹ پر اسکی سلائی اب بھی باقی ہے
نہ دیکھ اس ہیٹ کو یہ بھی ملا ہے ہم کو سرکاری

مرا استعفیٰ واپس کر دیا صاحب نے یہ کہہ کر
غلاموں کو بھی ہوتا ہے کہیں احساس خودداری

اب تو محمود دل کے بدلے حسیں
جیب ہی پر نگاہ کرتے ہیں

بات کرتے نہیں ہیں تو کیا ہے
پاس سے تو گزرتے رہتے ہیں

تقدیر آزمائی ہے ہر اک جگہ مگر
ایسی زمیں نہ تھی کہ جہاں آسماں نہ تھا

کوئی کھاتا ہے جو رشوت تو مجھے کیا اس سے
میں تو سچ کہہ کے حوالات سے ہو آیا ہوں

میں خود لانچ میں آ کر اس طرح خاموش ہوں ورنہ
دکھا دیتا تمھیں رشوت ستانی کس کو کہتے ہیں

جو جھوٹ کہہ کے داد بھی چاہے تو جان لو
لیڈر اگر نہیں ہے تو شاعر ضرور ہے

پھر پوچھتے ہیں وجہ ستم بانیٔ ستم
چوروں کو کیا بتائیں کہ لوٹے گئے ہیں ہم

تم اس کی بات میں آ کر مجھے مشرک سمجھتے ہو
جو ملا کفر کے فتوے لگاتا ہے برہمن پہ

کپڑے کے کنٹرول نے عاشق بنا دیا
دامن رہے آج کل نہ گریباں رہے آجکل

بد قسمتی سے جب سے ہے کپڑے پہ کنٹرول
دستِ جنوں میں چاکِ گریباں نہیں رہا

حرفِ آخر

حرفِ آخر

اگرچہ سابق صوبہ سرحد کے شعراء میں میں اپنی حیثیت بالکل
ایک مبتدی کی سی سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے اس بات کا فخر
ہے کہ مرزا محمود سرحدی مرحوم جیسے صاحبِ فن اور صاحبِ طرز
شاعر مجھے اپنے انتہائی قریبی دوستوں میں شمار کرتے تھے۔
وہ مجھے اپنا قلبی دوست سمجھتے تھے اور مجھے ان کی زندگی
کے آخری دس بارہ سالوں میں ان کے نہایت قریب رہنے کا

موقع ملا ہے۔
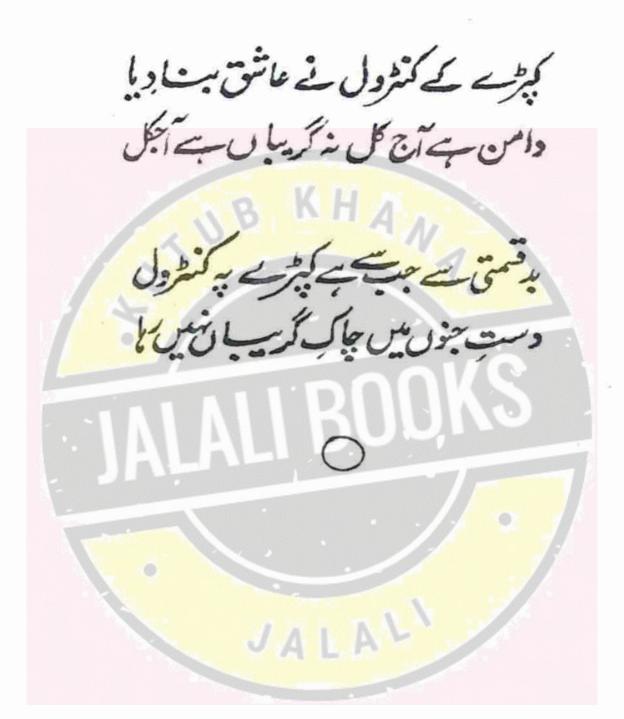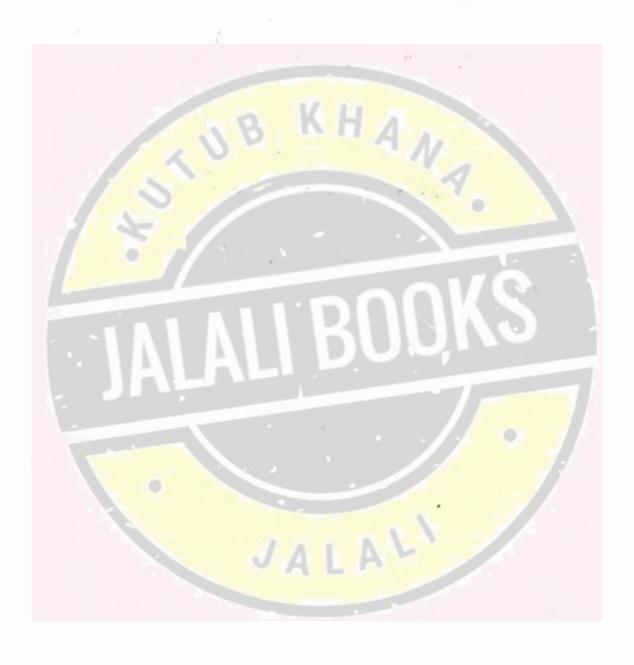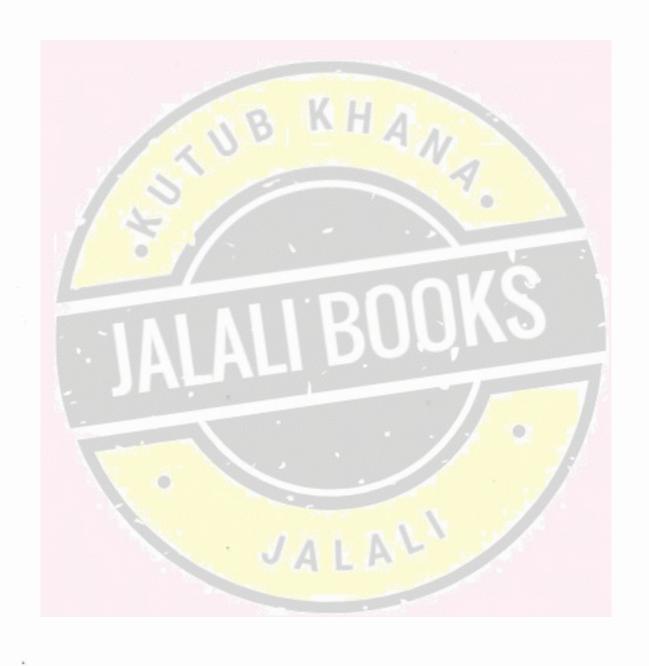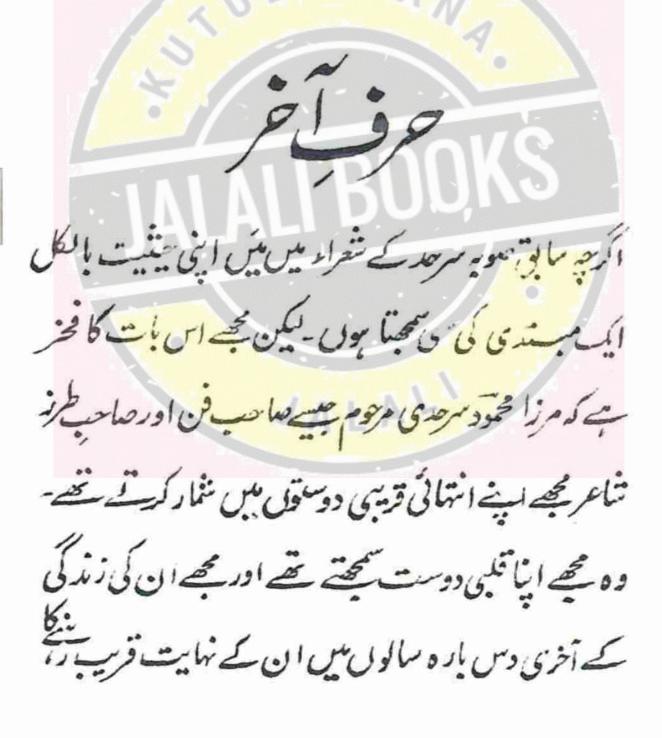
۱۹۵۷ء میں ہم دونوں اکٹھے روزنامہ "انجام" پشاور سے منسلک ہوئے۔ اس اخبار کی ادارت کے دوران وہ نہ صرف اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے بلکہ قدم قدم پر میری رہنمائی بھی کرتے رہے چونکہ ملازمت کو وہ ہمیشہ ایک زنجیر سمجھتے تھے۔ اور ہر ملازمت سے رہائی پانے کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ لہٰذا اس ادارہ میں بھی ان کا ساتھ ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکا اور وہ مستعفی ہو گئے۔ لیکن ملازمت ترک کرنے کے بعد بھی وہ اپنا بیشتر وقت اسی اخبار کے دفتر میں گزارتے تھے۔

مرزا محمود سرحدی برصغیر پاک و ہند کے طنّاز شعراء میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کے بعد انھوں نے

طنز و مزاح جیسے مشکل موضوع کو شعر و سخن کے لئے منتخب کیا اور
اس میدان میں آخری دم تک کسی کو بھی اپنے مقابلے میں ابھرنے
کا موقع نہیں دیا۔ مرزا مرحوم نے اس فن میں وہ کمال حاصل کیا جو
شاید ہی ان کے معاصرین میں سے کسی کے حصے میں آ سکے۔ ان
کے ہاں سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انھوں نے لطیف مزاح اور
پھکڑ پن کی سرحدوں کو کبھی آپس میں ملنے نہیں دیا۔ شاعری کی
اس صنف کو اپنانے والوں کے لئے سب سے بڑی مشکل
یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ مزاح کو اس کی مقررہ حدود تک پابند
رکھنے کا کمال نہیں رکھتے۔ لیکن مرزا مرحوم نے یہ احتیاط اس
خوبصورتی سے برتی کہ ان کی انفرادیت خود بخود ابھر کر
سامنے آگئی!

یہاں نہ تو مجھے ان کے کلام سے کوئی بحث کرنا ہے اور

نہ ہی ان کے فن کی انفرادیت کی وکالت کرنا مقصود ہے
کیونکہ اس شعری مجموعے کے آغاز میں میرے مقتدر دوستوں
نے اس موضوع پر کماحقہٗ روشنی ڈالی ہے۔

مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ مرزا مرحوم اگرچہ انتہائی
زود رنج طبیعت کے مالک تھے لیکن بے حد نرم دل اور پرخلوص
دوست تھے۔ طبیعت انتہائی سادہ تھی۔ دیرینہ دوستوں کو ہمیشہ
یاد کرتے تھے اور ان کی خوبیوں کو بڑے مزے لے لے کر
بیان کیا کرتے تھے۔ پشاور میں سید ضیاء جعفری۔ سید مظہر گیلانی
فارغ بخاری۔ سلطان زار۔ رضا ہمدانی اور احمد فراز کو اپنے
بہترین دوستوں میں شمار کرتے تھے اور ان سے متعلق پرانی
یادوں کی داستانیں بڑے اہتمام سے سنایا کرتے تھے۔

زندگی کے آخری دو سالوں میں دمہ جیسے موذی مرض
نے ان پر اتنا غلبہ پالیا تھا کہ دو قدم چلنے سے بھی معذور

ہو گئے تھے لیکن مرض کی شدّت اور کمزوری کے باوجود دن
کا کچھ حصّہ دوستوں کے پاس بیٹھ کر گزارتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء
میں جشنِ خیبر کا مشاعرہ ان کی زندگی کا آخری مشاعرہ تھا
اس کے بعد یہ شمع کسی ادبی محفل کو روشنی نہ دے سکی۔

مرزا مرحوم کے کلام کا زیرِ نظر مجموعہ ان کی وفات کے
ڈیڑھ سال بعد ان کے مداحین کے ہاتھوں میں پہنچنا یقیناً
ایک معجزہ سے کم نہیں۔ کیونکہ ایک ایسے شاعر کا کلام جو
مختلف صورتوں میں بکھرا پڑا ہو اور اس کی زندگی میں مجتمع نہ
ہو سکا ہو اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کے مراحل اتنے
کم عرصے میں طے کر لینا خاصہ مشکل کام ہے۔ اس کے علاوہ
مالی وسائل کا فقدان بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ لیکن مرزا مرحوم
کی خوش قسمتی کہیئے کہ پشاور کے ادب دوست ڈپٹی کمشنر نے
جو نہ صرف مرزا مرحوم کے فن کے معترف ہیں بلکہ ان کے دیت

بھی ہیں۔ مجموعہ کی اشاعت کے لئے مالی وسائل مہیا کئے اور مرحوم کے دیرینہ دوست فارغ بخاری صاحب نے اس کی ترتیب وتدوین کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اِس مجموعے کو منصۂ شہود پر لانے کی مسدود راہیں کھول دیں۔ میں مرزا مرحوم کے ایک قریبی دوست ہونے کی حیثیت سے پشاور کے علم دوست ڈپٹی کمشنر جناب سید سلیم عباس جیلانی اور سید فارغ بخاری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وساطت سے میرے مرحوم دوست کے کلام کو لافانی حیثیت نصیب ہوئی ہے۔

مسعود انور شفقی
پشاور
۱۳ر مارچ ۱۹۷۰ء
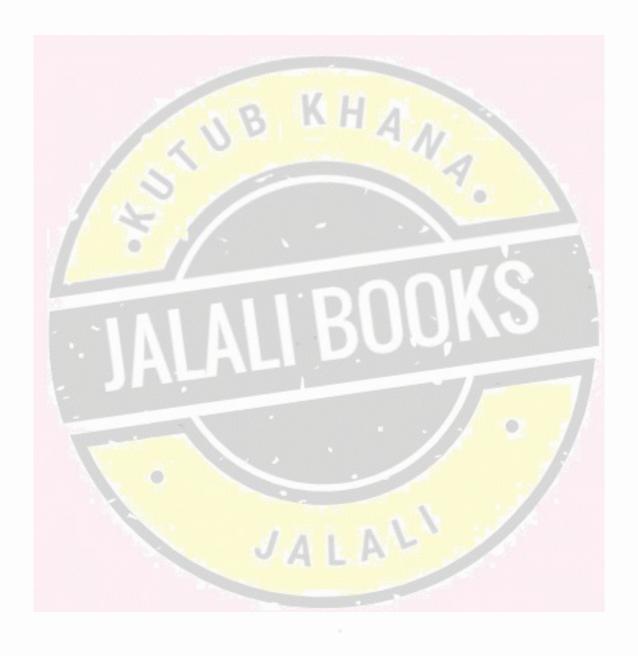
فارغ بخاری نے اردو شاعری کو نیا لہجہ دیا ہے

زیر و بم کے بعد فارغ بخاری کا

دوسرا مجموعہ

شیشے کے پیرہن

* نئی آواز
* نئی معنویت
* نیا آہنگ

عنقریب چھپ کر مارکیٹ میں
آ رہا ہے

●

ناشر

آئینۂ ادب ، چوک مینار، انارکلی، لاہور

طباعت سرورق : ربن پریس لمیٹڈ لاہور